حیدرآباد اکاڈیمی

مجموعۂ مقالات علمیہ

نمبر (۴)

سنہ ۱۳۶۱ھ
۱۹۴۲ء

شائع کردہ

مجلس ادارت حیدرآباد اکاڈیمی

فہرست مضامین

مجموعۂ مقالات علمیہ حیدرآباد اکاڈمی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

وھو العلیم الحکیم

پیش لفظ

حیدرآباد اکاڈیمی نے اپنے پیش نظر جس بلند مقصد کو رکھا ہے وہ اعلیٰ علمی و علمیاتی مذاق کی پرورش و حفاظت ہے۔ وہ اس مقصد کو مختلف ذرائع سے حاصل کرنے میں سرگرم عمل رہی ہے لیکن ایک اہم ذریعہ ایسا بھی تھا جس کو اکاڈیمی اپنے قیام کے زمانہ سے اب تک استعمال نہ کر سکی تھی اور وہ اپنے ارکین کی بعض تحقیقات کو سادہ علمی زبان میں ان ہی کی زبانی عوام تک پہونچانا ہے۔ بحمد اللہ اس سال اس نوی ذریعہ کے استعمال کا بھی موقع مل گیا چنانچہ ۱۶ شوال سنہ ۱۳۶۰ھ مطابق ۶ نومبر ۱۹۴۱ء سے اکاڈیمی نے اپنا "ہفتۂ علمی" منایا جس میں ملک کے مشاہیر علماء نے جو اکاڈیمی کے رکن ہیں اپنی تحقیقات کو نہایت دلکش اور دلچسپ پیرایہ میں تقریروں اور مقالوں کے ذریعہ سے عوام کی ایک بہت بڑی تعداد کے سامنے پیش کیا۔ اس ہفتہ کا افتتاح اکاڈیمی کے سرپرست اعلیٰ حضرت شہزادۂ والاشان ہز ہائنس پرنس آف برار نواب اعظم جاہ بہادر نے بنفس نفیس فرمایا۔ صدر اکاڈیمی کے اڈریس کا جواب مرحمت فرماتے ہوئے شہزادۂ والاشان نے تحقیقات علمیہ کو سادہ زبان کا جامہ پہنانے کے خیال کو ایک "مبارک خیال" سے تعبیر فرمایا اور توقع ظاہر فرمائی کہ "علم کے خدمت گزار افراد اس فریضہ کو کامیابی سے انجام دینگے"۔ علیا حضرت ہز ہائنس شہزادی درشہوار نے اپنے پیام میں اکاڈیمی کی علمی تحقیقات کی طباعت کا انتظام نہایت

ضروری قرار دیا ورنہ ادارہ کی قابلِ قدر محنتوں کے رائگاں جانے کا اندیشہ ہوگا۔ ہفتۂ علمی کے ختم ہوتے ہی اہلِ ملک کی جانب سے تمام تقریروں کو یکجا شائع کرنے کا شدید مطالبہ ہونے لگا اب اکاڈیمی مسرت کے ساتھ اس مجموعہ کو شائع کر رہی ہے یہ ہفتۂ علمی کے تمام مقالات و تقاریر پر مشتمل ہے صرف پنڈت دھارشور جی کی انگریزی تقریر "ہندومت کی روح" اس میں شائع نہیں کیگئی کیونکہ وہ حیدرآباد اکاڈیمی کے مجموعۂ مقالات نمبر (۳) میں انگریزی میں شائع ہوئی ہے "قطب شاہی نظامِ تعلیم و تربیت" پر انگریزی زبان میں تقریر کی گئی تھی یہاں اس کا اردو ترجمہ پیش ہوا ہے۔

ہفتۂ علمی میں تقریروں کی ترتیب یہ تھی:۔

(۱) قرونِ وسطیٰ میں عرب و عجم کے حکما	از محمد عبدالرحمن خاں
(۲) عدم نسخ قرآن	از مولانا محمد عبدالقدیر صدیقی
(۳) ہندومت کی روح	از پنڈت دھارشور
(۴) امام ابو حنیفہ کی تدوین قانونِ اسلامی	از ڈاکٹر محمد حمید اللہ
(۵) کائنات کا ارتقاء	از ڈاکٹر محمد رضی الدین صدیقی
(۶) قطب شاہی دور کا نظامِ تعلیم و تربیت	از پروفیسر میر احمد علی خاں
(۷) قرآن اور سیرت سازی	از ڈاکٹر میر ولی الدین

علمی مصلحتوں سے یہاں یہ ترتیب قائم نہیں رکھی جا سکی

کوشش کیگئی ہے کہ اس مجموعہ میں کوئی رگِ خام نہ رہے کیونکہ ہمیں اس کا علم ہے کہ ؎

در میوہ تو تا رگِ خامے بجائے ہست — در کام روزگار گوارا نمی شود

وما توفیقی الا باللہ

محمد عبدالرحمن خاں

صدر حیدرآباد اکاڈیمی

[illegible]

محترمہ مریم ملنگیری صاحبہ

اڈریس استقبالیہ

ایل ایل ڈی دام اقبالہ

بشرف ملاحظہ حضرت شہزادہ والاشان ہز ہائینس پرنس آف برار نواب اعظم جاہ بہادر ولی عہد سپہ سالار دولت آصفیہ

حضور والاشان!

عرصہ دراز سے ملک کے علمی تعلیم یافتہ طبقہ میں یہ محسوس ہو رہا تھا کہ ایک ایسی انجمن قائم کی جائے جو بلند پایہ علمی و حکمیاتی مذاق کی پرورش و حفاظت کی غرض سے،

(الف) ماہرین فن کے درمیان ارتباط قائم کرے۔

(ب) ان کی تحقیقات کو شائع اور ان کے کام میں سہولت پیدا کرے۔

(ج) ان کی بعض تحقیقات کو سادہ علمی زبان میں ان ہی کی زبانی عوام تک پہنچائے

(د) ان کا ایک ترجمان رسالہ ہو جو اس مقصد کے حصول میں سرگرم عمل رہے۔

بالآخر ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب سابق پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ کی حسن سعی سے نوجوانانِ ملک کے ایک جلسہ میں قرار پایا کہ اس مقصد کے لئے سربرآوردہ و ممتاز علما کی ایک انجمن موسوم بہ "حیدرآباد اکاڈیمی" قائم کی جائے چنانچہ بتاریخ ۹ امرداد سنہ ف اس خیال کو عملی جامہ پہنایا گیا۔

ابتدا ہی سے اکاڈیمی کے ارکان ملک کے منتہی اور فارغ التحصیل افراد ہیں جنہوں نے حیدرآباد بیرون حیدرآباد اور یورپ کی جامعات میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ اکاڈیمی کی رکنیت تحقیقاتی کام پر مشروط ہے اور اس کے تمام ارکان نے اپنی جامعاتی تعلیم میں تحقیقاتی کام کیا ہے اور اس کے طرز و طریق سے واقف ہیں۔ خوش بختی سے انہیں اپنے اس کام کو

جاری رکھنے کا موقع بھی حاصل ہے۔ وہ اس میں لگے ہوئے ہیں اور ان کی زندگی کی ساعتیں اسی میں گزر رہی ہیں۔

اکاڈیمی کی یہ خوش قسمتی ہے کہ اسے ملک کے ایسے افراد کی رکنیت حاصل ہو گئی اور ان ہی کے تعاون و اشتراک عمل سے اپنے مقصد کے حصول میں کوشاں ہے۔

اکاڈیمی نے سب سے زیادہ اہمیت اپنے علمی رسالہ کو دی اور اس کی اشاعت ایک زبردست مجلس ادارت کے سپرد کی جس نے فی الفور اپنا کام شروع کر دیا۔

اکاڈیمی کی اس نوعیت و خصوصیت کو جب حضور والا کے ملاحظہ میں پیش کیا گیا تو حضور والا نے اپنی علم پروری کے اُن آصفجاہی روایات کے مطابق جن کا شہرہ چار دانگ عالم میں ہے اس کی سرپرستی قبول فرمائی اور ساتھ ساتھ علیا حضرت ہز ہائینس شہزادی درشہوار نے بھی اس کی سرپرستی قبول فرما کر اس کو مزید عز و افتخار بخشا۔

کفالت و حفاظت کے اس جذبہ سے قوی ہو کر اراکین نے اپنا کام جاری رکھا اور بہت جلد انہوں نے اپنی محنتوں کے بعض نتائج ۱۹۳۹ء میں سالنامہ حیدرآباد اکاڈیمی کے نام سے شائع کر دیئے اور اس کا ایک ایک نسخہ ملک او ربیرون ملک کے مشاہیر علما کے ہاں روانہ کیا ہمیں یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ ملک و بیرون ملک، امریکہ اور انگلستان سے اس کے متعلق اچھی رائیں وصول ہوئیں۔ جامعہ کیمبرج کے سابق لوکاسین پروفیسر ریاضی سر جوزف لارمر اور جامعہ بون کے مستشرق حال مقیم کیمبرج پروفیسر کرینکو نے اس رسالہ کے مضامین کی ستائش کی۔ امریکہ سے پروفیسر ہٹی جو جامعہ پرنسٹن میں سامی ادب کے استاد ہیں اس کا خیر مقدم کیا۔ بین الاقوامی شہرت رکھنے والے جرائد ادیسس اور آئیسس کے مشہور و معروف مدیر پروفیسر جارج سارٹان نے اس کی بہت تعریف کی۔ ان کے خطوط اس قابل ہیں کہ میں ان کے بعض اجزا حضور والا کی اجازت سے پیش کروں سالنامۂ اول کو پڑھ کر وہ معتمد اکاڈیمی کو لکھتے ہیں۔

"یہ رسالہ آپ کی اکاڈیمی کے لئے باعث عزت ہے مجھے اپنی مبارکباد اور بہترین

تمناؤں کے اظہار کی اجازت دیجیے۔ میں اس کے بعض مضامین کا ذکر رسالہ آئسیس میں کردوں گا۔"

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں:۔

"ایک ایسے زمانہ میں جب کہ تہذیب یورپ معرض خطر میں پڑ گئی ہے یہ دیکھ کر مسرت ہوتی ہے کہ حیدرآباد میں اس کے تحفظ و ترقی کے لیے کوششیں عمل میں لائی جارہی ہیں۔"

جب کہ سنہ ۱۹۴۲ء کے آغاز میں ہم نے اپنا دوسرا ابراہن کے ہاں بھیجا تو انہوں نے اس کو پڑھ کر معتمد اکاڈیمی کو لکھا:۔

"سالنامہ اکاڈیمی کی دوسری جلد بابت سنہ ۱۹۴۲ء ایک ہفتہ پہلے مجھے ملی اور میں نے اس کا بڑا حصہ گہری دلچسپی سے پڑھا۔ اس کے متعدد مضامین کو رسالہ آئسیس میں چھپنے والی فہرست میں داخل کردوں گا۔ میں انجمن تاریخ سائنس کے معتمد ڈاکٹر روملیس سے کہہ رہا ہوں کہ آپ کا نام ہماری فہرست تبادلہ میں شامل کردیا جائے۔ براہ کرم اپنی مطبوعات کے متعلق میری مبارکباد اور حیدرآباد اکاڈیمی جامعہ عثمانیہ اور خود آپ کی ذات کے متعلق میری بہترین تمنائیں قبول فرمائیے۔"

ہمیں خوشی ہے کہ ہمارے اس کام سے ملک اور جامعہ عثمانیہ کی کچھ خدمت ہو رہی ہے جو ہمارا پہلا علمی فریضہ ہے۔ اکاڈیمی کوشاں ہے کہ اپنا بار آپ خود اٹھائے۔ بریں ہم بعض علم دوست حضرات نے اس کے ساتھ فیاضی برتی ہے میں اپنا یہ خوش گوار فریضہ سمجھتا ہوں کہ یہ عرض کردوں کہ جلد اول کی اشاعت نواب اکبر یار جنگ بہادر اور نواب دوست محمد خاں کے جود و کرم کی رہین منت ہے۔ ان کرم پیشہ حضرات نے ڈھائی ڈھائی سو روپے یکمشت ادا فرمائے اور اس طرح اکاڈیمی کی اس کے ابتدائی دور میں مدد کی۔ نواب دوست محمد خاں نے وعدہ فرمایا ہے کہ وہ باقساط ایک ہزار کی تکمیل فرمائیں گے اکاڈیمی ان حضرات کی بدل ممنون ہے۔

اکاڈیمی کے ان کارناموں کا جب ملک کے فیض رسان امیر نواب سالار جنگ بہادر کو

علم ہوا تو انہوں نے نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ اکاڈیمی کے لئے سالانہ تین سو روپیہ کی ابتدائی گراں بہا امداد کا وعدہ فرمایا اور بکمال مسرت اکاڈیمی کا نائب سرپرست ہونا منظور فرمایا۔ اکاڈیمی نواب صاحب معز کی رہین منت ہے۔

اکاڈیمی کے عہدۂ صدارت پر نواب مہدی یار جنگ بہادر پہلے دو سال فائز رہے۔ باوجود اپنی گوناگوں مصروفیتوں کے نواب صاحب نے انجمن کو اپنے قیمتی مشوروں سے مستفید فرمایا۔ اب نواب صاحب اکاڈیمی کے اعیان (وزیٹرس) میں ہیں اور ہمیں امید ہے کہ یہ ربط عرصہ دراز تک قائم رہے گا۔

اکاڈیمی نے سال گذشتہ اس ناچیز کو عہدۂ صدارت پر ممتاز فرمایا میری خوش قسمتی ہے کہ اس سال جب کہ اکاڈیمی نے اپنے اراکین کی بعض تحقیقات کو سادہ زبان میں ان ہی کی زبانی عوام تک پہنچانے کا کام شروع کردیا ہے میں حضور والا کی خدمت میں عرض کروں کہ اس مبارک و مسعود جلسہ کا افتتاح فرمائیں۔

اکاڈیمی کا مستقبل خدائے علیم و قدیر کے ہاتھوں میں ہے ہم اسی کی ہدایت و رہبری کے خواہاں ہیں۔

تکیہ نہ بر علم و عمل کردہ ایم ✤ بلکہ بر آں لطف ازل کردہ ایم

آخر میں میں صدق و خلوص کے ساتھ بارگاہ رب العزت میں دعا کرتا ہوں کہ خدا ہمارے شاہ ذیجاہ جلالت مآب حضرت ظل سبحانی سلطان العلوم خلد اللہ ملکہ و سلطنتہ اور شہزادگان بلند اقبال و شہزادیان فرخ فال کو ہمارے سروں پر ہمیشہ ہمیشہ سلامت رکھے۔ آمین۔

فدوی

محمد عبدالرحمٰن خاں

صدر حیدرآباد اکاڈیمی

تقریر افتتاحی

ہز ہائینس جنرل والا شان پرنس آف برار ولیعہد و کمانڈر ان چیف قلمرو آصفیہ

مولوی عبدالرحمٰن خاں اور ارکان حیدرآباد اکاڈیمی!

علم ہی وہ نعمت ہے جس کے باعث انسان مخلوقات میں ممتاز ہوا اور علمی ذوق کی پرورش نوع انسانی کی بہترین خدمت ہے۔ یہ منزل کچھ کم صبر آزما نہیں لیکن مبارک ہیں وہ ساعتیں جو دنیا کی آلائشوں اور ہنگاموں سے دور علم کی خدمت میں صرف ہوں۔

خوش بختی سے حضرت سلطان العلوم کے علم پرور عہد میں ہر علم و فن کے شیدائی کے لئے ترقی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں اور ہر قسم کی علمی تحقیقات کے لئے جد و جہد کے ساز و سامان مہیا ہو رہے ہیں۔ آپ کی مختول کے نتائج جن کو بیرون ملک بھی وقعت کی نظر سے دیکھا گیا ہے اس قابل ہیں کہ ان کی اشاعت کی طرف توجہ کی جائے۔ تحقیقات کو سادہ زبان کا جامہ پہنانا مبارک خیال ہے اور مجھے امید ہے کہ علم کے خدمت گزار افراد اس فریضہ کو کامیابی سے انجام دیں گے۔ اُن علم دوست اصحاب کی امداد قابل قدر ہے جو آپ کی انجمن کی کامیابی میں عملی دلچسپی لے رہے ہیں۔

اب میں اس جلسہ کے افتتاح کی مسرت حاصل کرتا ہوں۔

۱۶ شوال المکرم ۱۳۶۰ھ ۶ نومبر ۱۹۴۱ء

۲ ردے ۱۳۵۱ ف (پنجشنبہ)

سرپرست اکاڈمی ہز رائل ہائینس شہزادی در ار کا پیام

بموقع ہفتۂ علمی

"حیدرآباد اکاڈمی کی سرپرست کی حیثیت سے مجھے دلی مسرت ہے کہ یہ ادارہ اپنے مقاصد کے حصول میں سرگرم عمل ہے اور قلیل عرصہ میں علمی تحقیقات کا جو کام انجام پایا نہایت امید افزا ہے۔

"کسی ملک کے تہذیب و تمدن کا وقار اس کے فرزندوں کے علمی کارناموں ہی سے قائم ہوتا ہے اور تمام متمدن حکومتیں محققین کی ہمت افزائی کرتی ہیں۔ تحقیقات کی طباعت کا انتظام نہایت ضروری ہے ورنہ ادارہ کی قابل قدر محنتوں کے رائیگاں جانے کا اندیشہ ہے۔

"مجھے امید ہے کہ یہ ادارہ اپنے فاضل صدر کے زیر ہدایت ترقی کے مدارج طے کرنے میں ہر طرح کامیاب ہوگا۔"

مسئلہ عدم نسخ قرآن

نسخ الشئ ینسخہ نسخاً ازالہ اس نے شئے کو زائل کر دیا۔ یقال نسخت الشمس الظل والشیب الشباب ای ازالہ دھوپ نے سایہ کو بڑھاپے نے جوانی کو زائل کر دیا۔ ونسخت الریح آثار الدار غیرتہا ہوا نے گھر کے آثار کو کھنڈر کو متغیر کر دیا۔ وفلان الشئ ابطلہ اور فلاں نے اس شئے کو باطل کر دیا واقام شیئاً آخر مقامہ اور ایک دوسری شئے کو اس کی جگہ قائم کر دیا۔

قرآن شریف کی آیتوں اور احکام کے منسوخ ہونے میں اختلاف ہے۔ قرآن شریف کے تمام ادیان و ملل اور جاہل اقوام کے رسوم و عادات و احکام کے ناسخ ہونے میں ان میں تغیر پیدا کرنے میں نہ ہم کو نہ کسی اور کو کوئی اختلاف ہے۔ ان مفسرین کے اختلافات کا نتیجہ یہ ہوا کہ بعض کے پاس آیات احکام میں سے آدھے ناسخ و منسوخ ہیں۔ چنانچہ اس موضوع پر بڑی بڑی کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ابن العربی نے اس تعداد کو گھٹایا۔ حضرت امام جلال الدین سیوطی نے منسوخ آیتوں کی تعداد (۲۱) تک پہنچا دی۔ حضرت شیخ احمد بن عبدالرحیم شاہ ولی اللہ نے صرف (۵) تک باقی رکھیں۔ میرے خیال میں

قرآن کا کوئی حکم کوئی آیت منسوخ نہیں۔ شاہ صاحب نے ان (۲۱) آیتوں کے نسخ کے جو جوابات دئے ہیں ان کی تفصیلی شرح میں نے ایک مستقل رسالہ میں کی ہے۔ اس موقع پر صرف غلط فہمی کے اسباب مجمل طور پر بیان کروں گا۔ اور ان پانچ آیتوں کو بھی نسخ کے جھگڑے سے نکال دوں گا، جن کو شاہ صاحب بھی منسوخ ماننے پر مجبور ہوئے۔ اس طرح ان کے علمی خاندان کا ایک شخص ان کے مقصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیگا۔ وللہ الحمد

قدیم زمانے میں نسخ کے معنے تغیر کے لئے جاتے تھے پچھلی آیت کے حکم میں کچھ بھی تغیر دیکھتے تو کہہ دیتے کہ یہ آیت اس آیت کی ناسخ ہے۔

اصول فقہ میں، پہلی آیت کے حکم کو باطل کرنا، اور اس کے عوض دوسرا حکم قائم کرنا نسخ ہے اور اس وقت عامۃ الناس، نسخ کے یہی معنے لیتے ہیں۔

اس کے بعد واضح ہو کہ مفسرین کے اس قدر کثیر التعداد آیتوں کے منسوخ ماننے کے کیا اسباب ہوئے؟

(۱) قرآن شریف سے زمانہ جاہلیت کے رسوم و عادات یا سابقہ مذاہب کے حکم موقوف کر دیئے گئے ہوں یا ان میں تغیر کیا گیا ہو تو سابقین کہہ دیتے ہیں کہ یہ آیت ناسخ ہے مگر غور کیجئے کہ یہ آیت کیا کسی آیت و حکم قرآنی کی بھی ناسخ ہے؟ ہرگز نہیں۔ ہمارے زیر بحث تو آیات و احکام قرآنی کی منسوخیت ہے نہ کہ سابقہ رسوم و عادات اور احکام کا منسوخ ہونا۔

(۲) بعض وقت ایک عام حکم دیا جاتا ہے اور خاص حالات پر خاص حکم دیا جاتا ہے۔ اگر عام حکم کے ساتھ ہی وہ خاص حکم ہو تو اس کو استثنا کہتے ہیں۔ اور اگر کسی دوسرے موقع پر خاص حکم دیا جائے تو اس کو تخصیص کہتے ہیں۔ استثناء اور تخصیص کو عام حکم کا ناسخ کہنا درست نہیں تعزیرات ہندو دکن کے شروع میں استثنیات عامہ بیان کئے گئے ہیں تو کیا اس سے تمام تعزیرات

کا ایک قانون منسوخ شدہ ہو جائے گا؟ ہرگز نہیں والعصر ان الانسان لفی خسر الا الذین آمنوا۔ کیا الا الذین آمنو سے ان الانسان لفی خسر کا حکم منسوخ ہو گیا؟ ہرگز نہیں۔

نمبر ۶ قوانین مختص المقام بھی ہوتے ہیں اور مختص الوقت بھی۔ وقت گزرنے کے بعد وہ وقتی حکم باقی نہیں رہتا کیونکہ اتنے ہی وقت کے لئے یہ حکم دیا گیا تھا۔ نہ کہ وہ حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ مثلاً چار روز کے لئے کرفیو آرڈر جاری ہوا تھا۔ مدت گزرنے کے بعد وہ حکم باقی نہیں رہا اس صورت میں یہ کہنا کہ وہ حکم منسوخ ہو گیا۔ درست نہیں بلکہ ختم مدت کی وجہ سے وہ حکم باقی نہ رہا۔ اب میں عدم نسخ پر ایک اہم آیت کو پیش کرتا ہوں جو اس مسئلہ پر نہایت روشنی ڈالے گی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے واذ اخذ اللہ میثاق النبیین لما آتیتکم من کتاب وحکمۃ ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم لتومنن بہ ولتنصرنہ قال ءاقررتم واخذتم علی ذالکم اصری قالوا اقررنا۔ یاد کرو جب ہم نے تمام پیغمبروں کا عہد لیا تھا ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے پھر تمہارے پاس ایک رسول آئے جو تمہارے پاس جو کتاب ہے اس کی تصدیق کرتا ہے تو تم ضرور اس پر ایمان لاؤ اور اس کی نصرت و مدد کرو پھر ارشاد الٰہی ہوا کیا تم نے اس کا اقرار کر لیا اور اس کا ذمہ لے لیا۔ سب نے عرض کیا بے شک ہم نے اقرار کر لیا۔

ذرا اس آیت پر غور فرمایئے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے انبیاء کے ادیان وقتی تھے جب خاتم النبیین مبعوث ہوئے تو ان کا وقت ختم ہو گیا اس تحقیق پر تمام انبیاء کے ادیان بھی منسوخ نہیں ہوئے بلکہ ان کا وقت نہ رہا اس لئے وہ احکام بھی باقی نہ رہے۔

(۴) بعض دفعہ ایک دائمی حکم دینا مقصود ہوتا ہے مگر عمل یا اجتناب میں آہستہ آہستہ سختی بڑھائی جاتی ہے یہاں تک کہ حکم مقصود پر عمل کرنے کی لوگوں میں قابلیت پیدا ہو جائے یہ کمال حسن تعلیم و تربیت ہے ہمارے خیال میں ان ابتدائی مراحل کو منسوخ نہ کہنا چاہیے بلکہ اصل حکم کا توطیہ و تمہید سمجھنا چاہیے۔ اصل مقصود وہ حکم سمجھا جائیگا جو ہمیشہ کے لیے دیا جائیگا مثلاً شراب دفعتہ حرام نہیں کیگئی پہلے کہا گیا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سُکاریٰ یعنی شراب پیے ہوئے نماز کے قریب نہ جاؤ۔ پھر کئی مرحلوں کے بعد شراب حرام کی گئی پس لا تقربوا الصلوٰۃ کا حکم منسوخ نہیں ہوا، بلکہ وہ حرمتِ شراب کا مقدمہ اور تمہید تھا۔

ایک تاریخی واقعہ ہے کہ روسی لوگ بت پرست تھے۔ ان کا ایک وفد تحقیق مذہب کے لئے جب قسطنطنیہ پہنچا تو مذہب اسلام ان کو پسند آیا مگر اس میں شراب پینا بھی منع تھا روسی وفد نے کہا ہم سرد ملک کے رہنے والے ہیں بغیر شراب کے ہم آرام سے رہ نہیں سکتے علماء نے ترک شراب پر شدومد سے تاکید کی جس کا نتیجہ روسیوں کا نصرانی ہو جانا تھا اگر کفر کے مقابل نشہ سے خاموش ہو جاتے۔ بڑے شر کے مقابل چھوٹے شر کو اختیار کر لیتے تو اتنی بڑی قوم اسلام کے ہاتھ سے نہ نکل جاتی اللہ تعالیٰ چاہتا تو ایک ہی دفعہ میں شراب کو حرام کر دیتا مگر نہیں اس نے بمراحل رفتہ رفتہ اس کو حرام فرمایا۔
علماء اسلام کو بھی چاہیے کہ نومسلموں کو پہلے توحید کی پھر دوسرے اہم ارکان کی تعلیم دیں پھر رفتہ رفتہ ایک ایک حکم کا پابند بنائیں۔ ابھی غریب مسلمان ہوا۔ اس کا ختنہ بھی کروا ڈالا۔ فرض نمازوں کے ساتھ سنتوں کی سختی تاکید کی روزوں کے ساتھ تراویح بھی لگا دی۔ ان سب کاموں کی پابندی آہستہ آہستہ کروائی جائے فرض کے برابر سنن و نوافل کو اہمیت نہ دی جائے بغریب نومسلم پر اللہ رحم کریں)۔
(۵) بعض دفعہ ایک حکم فرض بھی ہوتا ہے اور مباح کی بھی اجازت دی جاتی ہے پہلے اس حکم فرض ہی کیوں سمجھا جائے کہ بعد اس کی منسوخیت کو ماننا پڑے۔ یا یوں سمجھو کہ

بعض احکام قانونی ہوتے ہیں اور بعض احکام اخلاقی ۔ اخلاقی حکم کو قانونی ہی کیوں مانا جائے کہ اس کی منسوخیت لازم آئے ۔ اخلاقی قانون کی خلاف ورزی پر قانون گرفت نہیں کرتا ۔

(۶) بعض وقت ایک جملے کے دو معنے ہوتے ہیں متکلم کا ایک مقصد رہتا ہے اور لوگ اس کے ایک جدا معنے سمجھتے ہیں متکلم دوبارہ صاف الفاظ میں اپنے مقصد کو ظاہر کرتا ہے لوگ سمجھتے ہیں کہ پہلا حکم منسوخ ہوگیا ۔ حالانکہ پہلا اور دوسرا حکم دونوں ایک ہیں لوگوں کے سمجھنے میں غلطی ہوئی ہے ۔

(۷) بعض دفعہ ایک خاص واقعہ میں حکم دیا جاتا ہے اور قید اتفاقی رہتی ہے ۔ ایک دوسرے جگہ میں وہ قید اتفاقی نہیں رہتی بلکہ عام حکم رہتا ہے جو مقصود و مدار حکم ہے اور لوگ سمجھتے ہیں کہ مقید حکم منسوخ ہوگیا ۔

(۸) بعض دفعہ ایک امر کے متعلق ایک حکم دیا جاتا ہے اور لوگ اس امر پر دوسرے امور کو قیاس کر کے اس حکم کو متعدی کرتے ہیں ۔ حالانکہ امر اول میں خصوصیات ہوتی ہیں جن کی بنا پر حکم دیا گیا ہے اور وہ حکم دوسروں کے لئے متعدی نہیں ہو سکتا ۔ لہذا امر اول پر جو قیاسات کئے جا رہے ہیں ان کے خلاف حکم دیا جاتا ہے ۔ اس طرح ان کے قیاسات غلط اور قیاس مع الفارق ثابت کئے جاتے ہیں اور لوگ ہیں کہ سمجھتے ہیں کہ پہلا حکم منسوخ ہوگیا ۔

(۹) لوگ سمجھتے ہیں کہ مدنی آیتوں سے جو غلبۂ اسلام کے زمانہ میں اتریں مکی آیتیں منسوخ کردی گئیں ۔ ذرا کوئی غور کرے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم النبیین ہیں ان کا دین ایک مخصوص زمانے کے لئے نہیں ہے قیامت تک رہنے والا ہے کیا مسلمان ہمیشہ غلبہ ہی رہے یا غلبہ میں ہیں کیا تمام ممالک کے مسلمانوں کی ایک ہی حالت رہتی ہے ؟ ہرگز نہیں ترکوں اور افغانوں کی مدنی حالت ہے عراق و شام و فلسطین والوں کی دو

ا

اب تو ایران کی بھی مکی حالت ہے ہر ایک کے لئے اس کے مناسب آیت و حکم ہے حالت بدل گئی تو حکم بھی بدل گیا لہذا مکی آیتیں بھی منسوخ نہیں بلکہ مدینہ والوں کے مناسب حال نہیں کیا مدینے میں جب آیت سیف اتری تو مکہ والوں نے ان پر عمل کیا؟ کیا اس آیت پر عمل نہ کرنے سے وہ سب عاصی تھے ہرگز نہیں۔ زمانہ گردش کرتا رہتا ہے۔ بعض مدنی آیتوں پر عمل کرنا اصولی آیات ولا تلقوا بایدیکم الی التہلکۃ اور لا یکلف اللہ نفسا الا وسعها کے خلاف ہوتا ہے پس مکی آیتیں اپنے مقام پر بحال ہیں اور مدنی اپنے مقام پر۔

اب میں پہلے ان دو اہم آیتوں کے متعلق بحث کرنا چاہتا ہوں جن سے مسئلہ ناسخ ومنسوخ کے سمجھنے میں فائدہ ہوگا۔ قال اللہ تعالی ما ننسخ من آیۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا۔ لفظ آیت کے معنے ہیں نشانی یا علامت اور کلام اللہ کا ایک فقرہ بھی ہے۔ لوگ اس آیت شریف کے معنے لیتے ہیں۔ ہم کسی آیت قرآنی کو منسوخ نہیں کرتے یا بھلا نہیں دیتے مگر اس سے بہتر آیت قرآنی یا اس کی مثل آیت لاتے ہیں۔

محل غور یہ ہے کہ قرآن تو بوعدہ انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون محفوظ ہے۔ ابتدا سے اب تک لاکھوں حافظ چلے آرہے ہیں پھر کب اور کونسی آیت بھلائی گئی؟ قرآن شریف کی ایک آیت سے بہتر دوسری آیت لانے کے معنے سمجھنا بھی بالکل نامناسب ہے لہذا اس کے صحیح معنے ہمارے خیال میں یہ ہیں، ہم اپنے آثار قدرت، اپنی نشانیاں اگر دور کرتے یا متغیر کرتے ہیں یا امتداد زمانہ کی وجہ سے بھلا دیتے ہیں تو اس سے بہتر یا اس کے برابر دوسری نشانی لاتے ہیں دیکھو آثار قدرت کے تازہ بتازہ جلووں کا سلسلہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا اس ترجمہ پر کوئی اعتراض نہیں۔ یہ آیت مسئلہ ناسخ ومنسوخ کی اصل سے جان ہے۔ قرآن شریف کو دیکھ

کہ آیت بمعنی آثارِ قدرت اور نشانی سے بھرا پڑا ہے لکن یہ من ایاتنا سنریھم ایاتنا فاتِ بایۃ ان فی السمٰوات والارض لایۃ للمومنین و فی الارض ایات للموقنین۔

مسلہ ابن حزم ظاہری ثبوت نسخ میں فرماتے ہیں کہ حضرت علی کا گذر ایک قاضی کے پاس سے ہوا۔ آپ نے اس قاضی سے سوال کیا کیا تم ناسخ کو منسوخ سے ممتاز کرتے اور سمجھتے ہو؟ قاضی نے کہا جی نہیں۔ حضرت علی نے فرمایا تم خود بھی ہلاک ہوئے اور دوسروں کو بھی تم نے ہلاک کیا میں عرض کرتا ہوں کہ قدیم محاورے میں نسخ کے معنے تغیر کے تھے جیسا کہ بیان کیا گیا پس حضرت علی کے ارشاد کے معنے یہ ہیں کہ کیا تم ان آیات کو جانتے ہو جس سے کسی عام آیت کی تخصیص ہوئی ہو یا اس سے چند لوگ مستثنےٰ ہیں؟

آیت دوم کافرون کی سورت میں ہے لکم دینکم ولی دین بسم اللہ الرحمن الرحیم قل یا ایھا الکفرون لا اعبد ما تعبدون ولا انتم عابدون ما اعبد ولا انا عابد ما عبدتم ولا انتم عابدون ما اعبد لکم دینکم ولی دین۔ اس کے معنی یہ لیئے جاتے ہیں کہ تم کو تمہارا مذہب مبارک۔ ہم کو ہمارا مذہب مبارک نہ تم ہم کو تبلیغ کرو نہ ہم تم کو تبلیغ کرتے ہیں۔ عیسی بدین خود۔ موسی بدین خود۔ اور پھر یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت آیت سیف سے منسوخ ہے میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اسلام تو ہمیشہ تبلیغی مذہب رہا اور رہیگا۔ اسلام میں بلغ ما انزل الیک ہے یا ایھا المدثر قم فانذر ہے اسلام میں عدم تبلیغ کا حکم کبھی نہیں دیا گیا۔

دیکھیئے دین کے معنے اگر جزا کے لئے جائیں تو کوئی خرابی پیدا ہی نہ ہو گی مالک یوم الدین کے معنے مالک روز جزا کے ہیں لہذا لکم دینکم ولی دین کے معنے ہیں تم کو تمہارے اعمال کی جزا اور ہم کو ہمارے اعمال کی جزا ضرور ملے گی۔ یہ حکم

نہ کبھی منسوخ ہوا ہے نہ کبھی منسوخ ہوگا پورے سورے کے معنے ہیں: اے پیغمبر تم کہدو۔ اے منکرو تم جن کی پوجا کرتے ہو میں ان کی پوجا نہیں کرتا۔ اور میں جس کی عبادت کرتا ہوں تم اس کی عبادت نہیں کرتے۔ میرا طریقہ عبادت جدا ہے تمہاری پوجا کا طریقہ علیحدہ ہے تم کو تمہارے اعمال کی سزا ضرور ملے گی اور مجھکو میرے اعمال کی جزا ضرور ملے گی۔

اب میں ان آیتوں سے بحث کرتا ہوں جن کو حضرت شاہ ولی اللہ رح بھی منسوخ ماننے پر مجبور ہوے۔

(۱) کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف حقا علی المتقین فرض کیا گیا ہے تم پر جب تم میں سے کسی ایک کے پاس موت آجائے اگر کچھ مال چھوڑے وصیت کرنا ماں باپ اور رشتہ داروں کے لئے مناسب طور پر یہ حکم پرہیزگاروں پر لازم ہے

لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت حدیث لا وصیۃ لوارث سے منسوخ ہے میں عرض کرتا ہوں کہ بھلا قرآن شریف کی آیت اس خبر آحاد سے کیونکر منسوخ ہوگی لہذا حضرت شاہ ولی اللہ صاحب فرماتے ہیں کہ نہیں یوصیکم اللہ فی اولادکم (اللہ تم کو اولاد کے متعلق وصیت کرتا ہے) اسسے یہ آیت منسوخ ہے اور حدیث لا وصیۃ لوارث اس نسخ کو بیان کرتی ہے میں عرض کرتا ہوں کہ اصل یہ ہے کہ مختلف اقوام میں ترکہ کے متعلق مختلف احکام و وصیتیں ہوتی ہیں بعض کے پاس مرنے والا جس کے لئے جو وصیت کرے قابل نفاذ ہے۔ بعض کے پاس صرف بڑا بیٹا وارث ہوتا ہے بعض کے پاس ترکہ میں عورتوں کو کچھ حصہ نہیں ملتا۔ اللہ تعالیٰ پہلی آیت میں یہ تکلیفیں اٹھاکر جتنے پانے والے ماں باپ اور دیگر رشتہ داروں کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ بالکل محروم نہیں ہوسکتے ان کے متعلق کچھ نہ کچھ وصیت کرنی ضرور ہے گویا کہ یہ آیت آیت توریث کی تمہید ہے پھر خدائے تعالیٰ سب کے حصے مقرر فرماتا ہے بغیر وارث

قرابتدار مثلاً پوتا جس کا باپ مرگیا ہو بیٹے کے ہوتے محروم ہے۔ نواسہ یا نواسی جس کی ماں مرگئی ہو بیٹی کے ہوتے محروم ہے۔ ان کے لئے اور دیگر امور خیر کے لئے باپ بھی ثلث مال سے وصیت کرسکتا ہے مگر جن کے حصے اللہ نے مقرر کئے ہیں اللہ نے جن کے لئے وصیت کی ہے ان کے لئے مرنے والوں کو وصیت کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس میں ناسخ و منسوخ کی بحث ہی کیا ہے۔ ایک آیت میں بعض رشتہ داروں کی اہمیت بتلائی گئی ہے اور دوسری آیت میں ان کے حصے جو اللہ تعالیٰ متعین فرمادیئے۔

(۲) ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین وان یکن منکم مائۃ یغلبوا الفا من الذین کفروا اگر تم میں بیس صابر سپاہی ہوں تو وہ اپنے سے دو گنے کافر دو سو پر غالب ہوجائینگے۔ اگر تم میں سے سو ہوں تو ہزار کافروں پر غالب آجائیں گے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ آیت بعد کی آیت سے منسوخ ہے بعد کی آیت یہ ہے الآن خفف اللہ عنکم وعلم ان فیکم ضعفا فان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین وان یکن الف یغلبوا الفین باذن اللہ واللہ مع الصابرین۔ اب اللہ نے تم سے تخفیف کردی اور جان لیا کہ تم میں ضعف ہے اب اگر تم میں سے سو صابر ہوں تو دو سو پر غالب آجائیں گے اور ہزار ہوں تو دو ہزار پر غالب آجائیں گے۔

میرے خیال میں پہلی آیت کے مخاطب وہ لوگ تھے جو فن سپہ گری میں ماہر تھے۔ ذاتی شجاعت میں ممتاز تھے۔ دل میں جوش ایمان تھا۔ خدا پر اعتماد تھا۔ اس طرح ان میں ہر طرح کی قدرت تھی اور دوسری آیت کے مخاطب بعد کے لوگ تھے۔ سابقین کا ایمان، انکی شجاعت انکی فن سپہ گری بعد کے لوگوں

میں کہاں تھی لہذا بجائے دہ چند کے دو چند سے لڑنے کا حکم دیا گیا۔ آیت کا دارو مدار ضعف و قوت پر ہے اگر اب بھی دس مسلمان مشین گن اور بندوق سے مسلح ہوں اور سو دشمن تلوار اور لٹ لے کر حملہ کر رہے ہوں تو اس صورت میں مسلمان قوی ہیں اور ان کو سو دشمنوں سے لڑنے سے ہرگز منہ نہ پھیرنا چاہیئے علت کے بدلنے سے حکم بدل رہا ہے اعلیٰ قوت کے وقت دہ گنوں سے کم قوت کے وقت دو گنے دشمن سے نہ بھاگنا چاہیئے پس ناسخ منسوخ کی بحث ہی کب رہتی ہے۔

(۳) انفروا خفافا و ثقالا جنگ کو نکل کھڑے ہو خواہ ہلکے پھلکے ہوں یا گران بار لوگ کہتے ہیں کہ یہ آیت آیت لیس علی الاعمی حرج اور لیس علی الضعفاء سے منسوخ ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ مراد خفافا سے یہ ہے کہ ضروریات جہاد مثلاً سواری، خادمین، سامان خورونوش کی مقدار کم از کم موجود ہو اور ثقالا سے مراد یہ کہ اشیاء وافر ہوں اب نسخ نہیں رہا۔ میں عرض کرتا ہوں کہ انفروا کے مخاطب عام ہیں ان سے معذورین مستثنےٰ ہیں اور استثنا نسخ نہیں ہو سکتا۔

(۴) الزانی لا ینکح الا زانیۃ او مشرکۃ و الزانیۃ لا ینکحھا الا زان او مشرک وحرم ذلک علی المومنین۔ زانی نکاح نہیں کرتا مگر زانیہ یا مشرکہ سے اور زانیہ کو نکاح نہیں کرتا مگر زانی یا مشرک اور یہ تو حرام ہے ایمانداروں پر۔

مفسرین کا خیال ہے کہ یہ آیت آیتِ وانکحوا الایامی منکم (نکاح کرو بے خاوند عورتوں کا) سے منسوخ ہے شاہ صاحب فرماتے ہیں امام احمدؒ نے اس کے ظاہری معنی پر حکم دیا یعنے زنا کار عورت سے مردِ متقی کا نکاح حرام ہے بلکہ زانی یا مشرک اس سے نکاح کر سکتا ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ مسلم عورت چاہے زانیہ ہی کیوں نہ ہو مشرک اس سے نکاح نہیں کر سکتا۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں اور دوسرے ائمہ کے پاس اس کے

یہ معنے ہیں کہ مرتکب کبیرہ زانیہ ہی کا کفو ہو سکتا ہے۔ یعنے متقی عورت کا کفو زناکار مرد نہیں ہو سکتا۔ اگر کسی عورت نے غیر کفو سے نکاح کر لیا تو رشتہ داروں کو نکاح فسخ کرا دینے کا حق ہے کیونکہ اس سے ان کے خاندان کی ذلت ہوتی ہے اور فرماتے ہیں کہ زانی سے نکاح کرنا مستحب نہیں ہے (حضور کے معنے مستحب نہیں کرنا کچھ دل کو نہیں لگتا) شاہ صاحب فرماتے ہیں ذالک کا اشارہ زنا اور شرک کی طرف ہے نہ کہ نکاح کی طرف۔ اس تاویل پر نکاح زیر بحث ہی نہیں رہتا۔ فقیر کے خیال میں اس آیت سے کوئی حکم نہیں دیا گیا بلکہ یہ بتلایا گیا کہ طبعی طور پر بدکار مرد بدکار عورت کی طرف ہی توجہ کرتا ہے۔ اگر حکم اتنا ہی ہوتا تو نہی ہوتی اور لا ینکح آخر کے جزم کے ساتھ ہوتا۔ مگر قرآن شریف میں لا ینکح بہ نفی آخر ہے۔ نیز جو عورت تائب ہو جائے وہ مومنات کے ذیل میں داخل ہو جاتی ہے اور اس آیت کے مصداق سے نکل جاتی ہے۔ ہاں ایسی صورت سے جو اس پیشہ کو چھوڑنا نہیں چاہتی نکاح درست نہیں۔ کیونکہ یہ نکاح نفسانی ہوگا۔ نعوذ باللہ یا نکاح کے لغوی معنے لیں یعنے جماع۔ پس معنے یہ ہونگے کہ بدکار عورت سے ناجائز تعلقات بدکار مرد یا مشرک رکھ سکتا ہے۔ ایمانداروں کے پاس تو بدکاری حرام ہے اس وقت ذالک کا اشارہ زنا کی طرف ہوگا۔

(۵) یا ایہا الذین آمنوا اذا ناجیتم الرسول فقدموا بین یدی نجوٰکم صدقۃ ذالک خیر لکم واطہر فان لم تجدوا فان اللہ غفور الرحیم۔ اے ایماندارو! جب تم سرگوشی کرنا چاہو رسول سے تو اس سرگوشی سے پہلے مسلمانوں کی کچھ مالی مدد کرو۔ خیر خیرات کرو۔ یہ تمہارے حق میں بہتر ہے پاک تر ہے! اگر تم نادار ہو دینے کے لئے کچھ نہیں پاتے تو اللہ غفور رحیم ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ آیت بعد کی آیت سے منسوخ ہے۔

میں عرض کرتا ہوں کہ اس آیت سے خیرات کی فرضیت کب نکلتی ہے اس میں تو

خیر لکم و اطہر ہے خیریت و طہارت صدقہ ناقابل نسخ ہے۔ اس میں یہ بھی تو ہے اگر تم نادار ہو تو اللہ غفور و رحیم ہے۔ حضرت کے زمانے میں بعض نادان اپنی عزت اور بڑھائی ثابت کرنے کو سرگوشی کیا کرتے اور بات کچھ اہم نہ ہوتی تو حکم دیا کہ پہلے مسلمانوں کی مالی امداد کر کے خود کو پہلے ہمدرد مسلمین تو ثابت کرو۔ پھر پیغمبر سے سرگوشی کرنے کا ارادہ کرنا۔ پیسہ تو ہاتھ سے نہیں نکلتا اور راز کی باتیں پیغمبر کو سنانے کا دعویٰ۔ بعد کی آیت میں ہے کہ اگر پیسہ خیرات نہیں کرتے تو نماز زکوٰۃ وغیرہ نیک کاموں سے اپنے نیک ہونے کا ثبوت دو۔ پھر پیغمبر سے سرگوشی کرنا۔

صاحبو! اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کو فرعون کی تبلیغ کے متعلق فرمایا فقولا لہ قولا لینا یعنے فرعون سے نرمی کے ساتھ گفتگو کرو۔ اسی طرح حبیب خدا محمد مصطفےٰ صلعم کو فرمایا۔ وجادلھم بالتی ھی احسن یعنے بہترین طریقہ سے منکرین سے مناظرہ کرو ان کو سمجھاؤ۔ ان مفسرین کے پاس آیت سیف سے آیت اور ایسی آیتیں جو دشمنوں سے مراعاۃ و حسن کلام پر دلالت کرتی ہیں سب منسوخ ہیں۔ انکو خیال کرنا چاہیئے کہ جنگ کا وقت اور ہوتا ہے اور تبلیغ و تعلیم کا وقت خیر۔ حسن کلام و حسن سلوک کا حکم ہرگز منسوخ نہیں ہو سکتا جنگ کرنا خلاف شرافت نہیں بدگوئی بے شک خلاف تہذیب ہے۔ اسلام کو بدنام نہ کرو۔ اس کی تہذیب کو عیب نہ لگاؤ۔

اس سے زیادہ ظلم ان مفسرین کے پاس ایک اور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض آیتیں تھیں تو قرآن کی مگر ان کے پڑھنے کا اب حکم نہیں اور ایسی آیت کو ثابت الحکم اور منسوخ التلاوت کہتے ہیں۔ مثلاً الشیخ والشیخۃ اذا زنیا فارجموھا یعنے بوڑھا بوڑھیا زنا کے مرتکب ہوں تو ان کو سنگسار کرو۔ محصن و محصنہ یعنے شادی شدہ کی سنگساری کا حکم سابقہ مذاہب میں تھا اسلام نے اس کو باقی رکھا

کوئی تازہ حکم نہیں دیا۔ مگر غیر شادی شدہ کے لئے حکم جلد میں درے مارنے کا
حکم دیا الزانیۃ والزانی میں الف لام عہدی ہے اس سے غیر محصن و غیر محصنہ مراد
ہیں قرآن کے غیر مستند ہونے کا الزام یہود اور ابنائے یہود کے وسائس سے ہے
اس حکم میں بعض سادہ دل علماء آجاتے ہیں۔ ذرہ بھی غور کرو شیخ کے معنی بڑھے
کے ہیں یا شادی شدہ کے جوان بھی شادی شدہ ہو سکتا ہے اور بوڑھا بھی
غیر شادی شدہ رہ سکتا ہے۔ شیخ کے معنی شادی شدہ کے بیان زبردستی ہے۔ اچھا شیخ کا مونث
تجویز ہے یا شیخہ انا عجوز وھذا بعلی شیخا۔ شیخۃ کا لفظ کسی شعر میں کسی کتاب
میں ملا نہیں میں اس کو قرآن شریف پر ظلم سمجھتا ہوں۔ قرآن شریف متواتر ہے۔ اس
میں ایک لفظ زیادہ نہیں۔ ایک لفظ کم نہیں۔ فقیر کو قرآن مجید بروایت عاصم کوفی حفص
عثمان، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت
ابی بن کعب رضی اللہ عنہم سے جو سب کے سب حفاظ تھے متواتر طریقہ پر پہنچا اس متعبر
و متواتر روایت کے خلاف فقیر ایک لفظ بھی غیر متواتر، آحاد کا سننا نہیں چاہتا۔ قرآن
شریف کو ناقابل اعتبار بنانے کے لئے منافقوں نے یہ فتنے پیدا کئے مگر کوئی ان
سے پوچھے کہ ایک روایت کی تو تصحیح کرو۔ متواتر تو کجا خبر آحاد سے بھی قرآن کے
خلاف ایک حکم کا ثبوت ممکن نہیں قرآن شریف محفوظ ہے ابتداء سے اب تک
حفاظ۔ حقیقتاً اس کے تواتر کی حفاظت کرتے ہیں اس متواتر کے مقابلہ میں کوئی
روایت کوئی دعویٰ ناقابل اعتنا ہے جس کی خدا حفاظت کرے اس میں کسی کی مقدور
نہیں کہ کچھ تحریف کر سکے۔

اللہ تعالیٰ ان دسائس اور ان وساوس سے مسلمانوں کو بچائے۔ آمین

محمد عبدالقدیر صدیقی قادری



قرآن

اور

سیرۃ سازی

شہ نیست کہ تخت ما بے دارد   تا آنکہ نہ شاہانہ مزاجے دارد
یعنی کہ خروس پیش ارباب شعور   سلطان نشود اگرچہ تاجے دارد ([illegible])

دنیا کی سب سے زیادہ خوبصورت شئے سب سے زیادہ گراں قدر اور عزیز شئے
پاک سیرت ہے! زندگی تربیت گاہ ہے حق تعالیٰ مربی و معلم ہیں۔ واقعات و حادثات
وہ آلات و ادوات ہیں جن کے ذریعہ وہ ہماری سیرت ہی کی تکمیل کرتے ہیں۔
دنیا کی روح ساز وادی میں کبھی غم کے مضراب سے اور کبھی خوشی کے تاروں سے ہم
سیرت ہی کے خفتہ نغمے بیدار کئے جاتے ہیں۔ زندگی کی غایت ہی یہ نظر آتی ہے کہ
سیرت کو سنوارا جائے، پختہ کیا جائے، کامل بنایا جائے کیوں؟ اس لئے کہ سیرت ہی
پر دین کی کامیابی کا انحصار ہے سیرت ہی پر فوز آخرت کا مدار ہے دین و دنیا کی
اصلاح سیرت ہی کی اصلاح سے ہو سکتی ہے۔ سیرت پر جسمانی اور روحانی صحت مبنی ہوتی
ہے اور برد قلبی اور طمانیت خاطر پاک سیرت ہی کا نتیجہ ہے! بنی آدم کا مہ اکرام"

سیرت ہی کی پاکی کی وجہ سے ہوتا ہے جو انسان پاک سیرت نہیں وہ صورۃً گو انسان ہے لیکن حقیقتاً وہ حیوان ہے یا دیو ہے یا غول ہے "شیاطین الانس" میں اس کا شمار ہے وہ دنیا دین و آخرت کی حقیقی اقدار سے محروم ہے۔

سیرت، علما نفسیات کی باریک بیں اور دوررس نگاہ میں ان تنفنات، عادات و میلانات کا مجموعہ ہے جو فرد کے کردار کی رہنمائی کرتا ہے، اس کو دوسروں سے ممیز کرتا ہے اور اس کی وحدت کردار کا باعث ہے۔ ہر فرد دوسرے فرد سے ممیز ہوتا ہی صورت اور سیرت میں۔ صورت کی غیریت تو حقیقی واقعی ہوتی ہے، یہ رفع نہیں کیجا سکتی ہے اور نہ کوئی اس کو رفع کرنا چاہتا ہے لیکن سیرت میں ایک قسم کی مماثلت ہو سکتی ہے یہ مماثلت عینیت نہیں۔ انفرادیت ناقابل انکار ہے، باوجود مماثلت کے انفرادیت موجود ہوتی ہے اس انفرادیت کا مبدء انا اور اس کے وہ اقتضاءات و قابلیات ہیں جو اپنا ظہور عادات و افعال میں کرتے ہیں اور اس تمام مجموعہ کو ہم نفسیات کی اصطلاح میں سیرت سے تعبیر کرتے ہیں۔ سیرت افعال میں وحدت پیدا کرتی ہے اور سیرت کے کامل علم کے بعد بڑی حد تک فرد کے افعال کی پیشین گوئی ممکن ہو جاتی ہے۔

سیرت کی تحلیل میں ہمیں اس امر کا خیال رکھنا چاہیئے کہ یہ عادات کی تنظیم کا نام ہے۔ افعال کا صدور بظاہر محرکات پر مبنی ہوتا ہے لیکن محرکات کا ماخذ و منبع وہ تقتضیات وا ذہانات ہوتے ہیں جو انسان زندگی کے تجربات، ماحول کے اثرات تعلیم اور دوسرے ذرائع سے حاصل کرتا ہے۔ علم و یقین، عمل و عادت یہ وہ اہم عناصر ہیں جن سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ سیرت سازی کے طریقے کو جاننے کے لئے ہمیں ان ہی عناصر کی تحقیق کرنی ہوگی۔

(۱) **علم و یقین:** العلم نکتۃ، سیرت سازی کے لئے صرف ایک نکتہ کا وجدانی اجمالی علم کافی ہے؛ پھر عقلی طور پر اس کی تفصیل و توضیح میں دفاتر رنگے جا سکتے

ہیں۔

دل گفت مرا علمِ لدنی ہوس است — تعلیم کن گرت بدیں دسترس است
گفتم کہ الف دگر نگفتم ہیچ — در خانہ اگر کس است یک حرف بس است

(شیخ عز الدین محمود الکاشی)

وہ وجدانی علم، علم لدنی حق تعالیٰ کی الوہیت کا اقرار ہے اسی اقرار کی مضبوط چٹان پر سیرت کی مشید عمارت تعمیر کی جا سکتی ہے اس اقرار کے تضمنات پر غور کرو۔ جب میں ایمان و اذعان کی شاہانہ قوت سے حق تعالیٰ کے الٰہ ہونے کا اقرار کرتا ہوں تو سب سے پہلے میں یہ مان رہا ہوں کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں وہی عبادت یا پرستش کے قابل ہیں عبادت کیا ہے؟ یہ غایت تذلل کا نام ہے، اظہار ذلت کا نام ہے میرا یہ سر اگر جھک سکتا ہے تو میرے خالق میرے مولیٰ میرے مالک و حاکم ہی کے سامنے جھک سکتا ہے اور غیر کے سامنے ہرگز نہیں جھک سکتا۔ اظہار ذلت کی وجہ کیا ہے؟ میں فقیر ہوں محتاج ہوں۔ میرا معبود غنی ہے قوت و اقتدار سے متصف ہے علم و حکمت سے موصوف ہے، رب ہے، پالنے والا ہے، مستعان ہے۔ مدد کرنے والا ہے استعانت ہی کی خاطر اس کے سامنے اظہار ذلت کرتا ہوں اور جانتا ہوں کہ سارا عالم فقیر ہے اور میرا معبود ہی صرف غنی و حمید ہے، میں اس کا فقیر ہو کر سارے عالم سے غنی ہوں۔ میرا یہ احساس کہ میں اس شہنشاہ کا دریوزہ گر ہوں جس کے دریوزہ گر سارے بادشاہ، گدا ہیں مجھے سارے عالم سے بے نیاز کر دیتا ہے اور میں "کفیٰ باللہ وکیلا" کہہ کر عبادت و استعانت کے نقطۂ نظر سے ماسوی اللہ سے کٹ جاتا ہوں اور فقر و ذلت یا بندگی کی نسبت اللہ ہی سے جوڑ لیتا ہوں اب کائنات کی بڑی سے بڑی قوت بھی میرے لئے نہ امیدوں کا مرکز بن سکتی ہے اور نہ خوف و ہراس کا سبب۔ ان سب کا فقر، ان سب کی ذلت و مجبوری و بیچارگی

وبے بسی میری نظروں میں اتنی ہی آشکارا و ہویدا ہوجاتی ہے جتنی کہ خود میری بیکسی و مجبوری۔ ہم سب عبد ہیں، کوئی چیز اصالۃً ہماری نہیں۔ فقر ہماری ذاتی صفت ہے۔ امانۃً چند روز کے لئے چند چیزیں ہم کو دی جاتی ہیں، نادانی سے ہم ان کو اپنی سمجھنے میں حقیقی مالک کو بھول جاتے ہیں ان ہی کی محبت میں فریفتہ ہوجاتے ہیں حقیقی اقدار سے غافل ہوجاتے ہیں۔ ناگہاں یہ طلسم ٹوٹ جاتا ہے اور یہ ساری محبوب و مرغوب چیزیں موت ہم سے چھین لیتی ہے اور پھر پٹ اصلی فقر و ذلت کے ساتھ ہم نادم و پشیمان اس جہاں سے رخصت ہوجاتے ہیں تاکہ اپنے اعمال کے اثرات کو اپنے افعال کے نتائج کو، اپنے کردار کے اثمار و عواقب کو جو اس دنیا میں اپنی موجودگی کا مختلف رنگوں میں میں احساس بخش رہے تھے زیادہ اجاگر زیادہ واضح و نمایاں طریقے سے دیکھیں اور حسرت اور ندامت کی آگ میں جلیں۔

سیرت کی تعمیر اسی اساسی یقین پر ہوتی ہے کہ حق تعالیٰ ہی معبود ہیں جن کے آگے یہ میرا سر جو سارے جہاں کے مقابلہ میں معزز و مفتخر، بلند و بالا ہے، فقیرانہ شان سے جھک رہا ہے اور حیات، علم، رزق و فراخی، صحت و عزت، ہدایت و رشد کی التدعا کر رہا ہے اور غیر متزلزل یقین کے ساتھ کر رہا ہے کہ جو اس کی آنکھ چاہے جو تماشہ دکھلائے اور جو ہم چاہتے ہیں جو مانگے اور ہوائے، یہ ساری نعمتیں حق تعالیٰ ہی دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں ان کے سوا کسی میں حول و قوت ہے اور نہ فعل و اثر، وما من نعمۃ فمن اللہ! صورتوں سے جو ہم نے امیدیں باندھ رکھی ہیں صورتوں کو جو ہم نے ہونے کی چیزیں سمجھ رکھا ہے، صورتوں کے سامنے جو ہم ذلت کا اظہار کر رہے ہیں اور صورتوں کے سامنے ہاتھ پھیلا رہے ہیں اور ان کو رب بنا رکھا ہے یہ کس قدر عظیم الشان دھوکا ہے ضروا ضلال کا پہلا کس قدر قوی ہے، عزت نفس کی خونریزی کر دیکھو اپنی ذلت و رسوائی کو دیکھو۔ اس کذب وافترا

کے نتائج پر غور کرو، فقیروں کے در پر سوال کرنے سے تم کو کچھ ملا ہے؟ اس غریب کے ہاں کیا رکھا ہے جو دوسروں کو دے! امید اس کا حوالہ ہونا لازمی ہے۔ حسرت و حرمان قطعی ہے جو بے چارہ اپنے درد و دکھ کو نہ کر سکتا ہو وہ تمہارے درد و غم کا کیا علاج کر سکتا ہے وہ تمہارا سوالی در صاحب ہو سکتا ہے! افسوس تم نے حقیقت کو چھوڑ کر سایہ کا تعاقب شروع کر دیا ہے بیدار کو چھوڑ کر مدہوش سے التجا کر رہے ہو۔ زندہ کو چھوڑ کر مردے سے لپٹے ہوئے ہو! تمہارے وہم نے تمہیں کس التباس میں مبتلا کر رکھا ہے۔

بقولِ دشمن پیمانِ دوست بشکستی
ببین کہ از کہ بریدی و با کہ پیوستی

معبود و مستعان صرف حق تعالیٰ ہے، ذل و افتقار کی نسبت ان ہی سے جوڑنا چاہیے وہی ہماری امیدوں کے مرکز ہیں، ان ہی کی ناراضی سے ہمیں خوف کرنا چاہیے۔ ان چوب و سنگ و گوشت و پوست کے جھوٹے خداؤں سے بندگی کی نسبت قطعاً توڑ لینی چاہیے

تا چند گہ از چوب گہ از سنگ تراشی
بگذر از خدائے کہ بصد رنگ تراشی!

حق تعالیٰ کی معبودیت و ربوبیت پر یقین، یہ ایمان سیرت کا سنگ بنیاد ہے اسی یقین کی پرورش ہونی چاہیے۔ آلہہ باطلہ کی نفی الٰہ حق کا اثبات قلب کی گہرائیوں میں متمکن ہو جائے۔ تحت الشعور نفس میں جاگزیں ہو، رگوں میں خون کی طرح دوڑ جائے، علم الیقین کے مرتبہ سے گذر کر حق الیقین کے درجہ تک پہنچ جائے، متحقق ہو جائے تو پھر ایسی شخصیت کی تخلیق ہوتی ہے جس کا مقابلہ کائنات کی کوئی قوت نہیں کر سکتی، وہ بفحوائے تخلقوا باخلاق اللہ خلق الٰہی سے

مزین ہوتا ہے۔ تمام صفات رذیلہ سے پاک اور تمام اوصاف حمیدہ سے آراستہ و پیراستہ ہوتا ہے کامل عبد ہوتا ہے، جس سے بہتر جس سے زیادہ مقدس دنیا میں کوئی شئے نہیں ہوتی۔

توحید معبودیت کی رو سے حق تعالیٰ ہی مالک و حاکم قرار پاتے ہیں اور مستحق عبادت ٹھہرتے ہیں ہمارا سر حقیقی مالک و حاکم ہی کے سامنے جھکتا ہے جس کے آگے ساری کائنات سرنگوں ہے طوعاً و کرہاً اور توحید ربوبیت کی رو سے حقیقی فاعل حق تعالیٰ ہی قرار پاتے ہیں وہی خالق ہیں وہی نافع وضار ہیں وہی زندہ کرتے ہیں اور مارتے ہیں، ہمارا ہاتھ ان ہی کے آگے دراز ہوتا ہے اور ان ہی سے ہم مدد و اعانت کے لیے درخواست کرتے ہیں! غنی کی فقیری ہمیں ساری کائنات سے بے نیاز اور غنی کر دیتی ہے۔

دیکھو توحید معبودیت و ربوبیت کا سبق دے کر عرب کے امی معلم (فداہ ابی و امی) نے اپنے متبعین کو صفات رذیلہ سے کس طرح پاک اور صفات حمیدہ سے کس طرح مزین کر دیا تھا۔ صفات رذیلہ جن سے تمام علماء اخلاق قلوب کا تزکیہ چاہتے ہیں اس رباعی میں یوں ادا کیے گئے ہیں۔

خواہی کہ شود دل تو چوں آئینہ   دہ چیز بروں کن ز درون سینہ
حرص و حسد و بخل و حرام و غیبت   کذب و غضب و کبر و ریا و کینہ

دیکھو ان صفات قبیحہ سے قلب کا تزکیہ "سقراط کے طنزیات"، افلاطون کے "مکالمات" ارسطو کی "اخلاقیات" اور جدید فلسفیوں کے عالمانہ خطبات "کے بغیر پڑھے اور سمجھے صرف لا الٰہ الا اللہ کے مختصر جملہ کو ماننے اور اس پر عمل پیرا رہنے سے کس آسانی سے ہو جاتا ہے!

جب تک انسان دولت کو اپنی ملک سمجھتا ہو خود کو اس کا مالک

جاتا ہے نہ حرص کا اس کے قلب سے تسلط اٹھ سکتا ہے اور نہ بخل و حسد کا۔ جوں ہی اس نے سچے دل سے توحید فی الآثار کا اقرار کیا اور یہ مان لیا للہ ما فی السموات وما فی الارض وما بینہما (اللہ ہی کے لئے ہے سارے آسمان اور زمین اور ان کے درمیان جو کچھ ہے) تو اس نے اپنی مالکیت وحاکمیت کی نفی کی اور حق تعالیٰ کی مالکیت وحاکمیت کا اثبات کیا۔ حقیقی مالک ومتصرف حق تعالیٰ کو جانا اور اپنی ذات کو محض امین سمجھا۔ اب اس کی سمجھ میں یہ بھی آگیا کہ حقیقی مالک ہی کو تصرف کا حق حاصل ہوتا ہے۔ امین امانت کے تحت ہی تصرف کا اختیار رکھتا ہے۔ اب اگر دولت پر جو اس وقت اسکی امانت میں ہے کوئی آفت آجاتی ہے تو وہ بحیثیت امین اس کو بچانے کی حتی الامکان کوشش کرتا ہے، اگر بچ نہ سکے تو جانتا ہے کہ مالک حقیقی امانت کا استرداد چاہتا ہے اور بخوشی وہ اپنی امانت حوالہ کر دیتا ہے۔ اس طرح نہ اس کے جانے کا رنج ہوتا ہے اور نہ اس کے آنے کی خوشی، اور اس کا قلب ان اختلال پیدا کرنے والے تاثرات سے پاک و آزاد رہتا ہے اور وہ

ع یک دل داری بس است یک دوست ترا، کہہ کر حق تعالیٰ ہی کو اپنا محبوب قرار دیتا ہے اور ایکدم رنج وغم، پریشانی وپشیمانی کے تمام احساسات وجذبات سے حقیقی معنے میں نجات حاصل کر لیتا ہے! ایسی ہی خوش قسمت کی ذہنیت کو ان الفاظ میں پیش کیا گیا ہے: لِکَیْلَا تَاْسَوْا عَلٰی مَا فَاتَکُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰکُمْ [1] (پ ۲۷ ع ۱۹)

ان اصول کو سمجھ لینے کے بعد غور کرو کہ وہ شخص حریص کیسے ہو سکتا ہے جو مال و دولت کا حقیقی مالک حق تعالیٰ کو سمجھتا ہے اور ان احمقوں کو جو اپنی ذات کو مالک سمجھ رہے ہیں مخاطب کر کے کہتا ہے:۔

---

[1] تاکہ تم غم نہ کھاؤ اس پر جو ہاتھ نہ آیا اور نہ شیخی کرو اس پر جو تم کو اس نے دیا

گماں مبر کہ زر و سیم دادہ اندترا | ودیعتے است داری بدست روزے چند
چہ سود گر بشوی غرہ بر متاع کسی | چو موش بر سر دکان دستا خورسند

حرص کے ساتھ بخل و حسد کی بھی جڑیں کٹ جاتی ہیں۔ جب مال و دولت ودیعت و امانت ہیں اور وہ بھی چندروزہ امانت، موت کے وقت یہ ہم سے واپس لے لی جاتی ہے اور دوسروں کے حوالہ کیجاتی ہے تو پھر اس علم کے بعد بیماری ذہنیت، اس چوہیا کی طرح کس طرح رہ سکتی ہے جو بنیئے کی دکان کی ساری چیزوں کو اپنی سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک سمجھتی ہے اور اپنے ہی کو مالک و متصرف جان کر بخل و حرص کا شکار بنتی ہے! غیر کے مال میں بخل بے معنی ہے بخل ہوتا ہے اپنے مال میں، مال اپنا نہیں پھر بخل کیسے؟ حرص کی بنیاد ہی اس خیال پر قائم ہے کہ مالک ہم ہیں حقدار ہم ہیں، ہم کو نہیں مل رہا ہے دوسروں کو مل رہا ہے، ہم کو کیوں نہ ملے! جب مال میرا ہے نہ تیرا بلکہ مالک حقیقی کا تو حسد کس پر؟ حسد و حرص اور ان کے لازمی نتائج ہم و غم، درد و حزن، رنج و الم نتیجہ ہیں خیانت فی الامانت کا یعنی شرک کا، جوں ہی شرک کی جڑیں قلب سے لا الہ الا اللہ کے ذریعہ اکھاڑ کر پھینک دی گئیں اور اس کی بجائے توحید جلوہ افروز ہوگئی، انسان ان تباہ کن جذبات کے چنگل سے نجات پاتا ہے حقیقی آزادی کا لطف اٹھاتا ہے سکون و بردقلبی کی دولت سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

کبر و فخر و عجب کی اس قلب میں گنجائش ہی کہاں جو اپنے کو حاکم نہیں محکوم مالک نہیں مملوک، رب نہیں مربوب، مولیٰ نہیں عبد سمجھتا ہو۔ اپنی محکومیت و مملوکیت کا یقین جو موحد کے قلب کی گہرائیوں میں جاگزیں ہے فخر و غرور کے جذبات کو پیدا ہونے نہیں دیتا۔ اس کی عضویت اس زہر کو قبول کرنے کی صلاحیت یا استعداد ہی نہیں رکھتی۔

اب توحید فی الربوبیت کے قیام کے آثار پر غور کرو جب تم نے فاعل حقیقی حق تعالیٰ کو مان لیا لاحول ولا قوۃ الا باللہ کے قائل ہو گئے، نافع وضار فی الحقیقت ان ہی کو سمجھنے لگے تو خوف وحزن سے تم نے رستگاری حاصل کر لی غیر کو نافع و ضار قرار دینے کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ تم کو اس سے نفع پہنچنے کی امید ہوتی ہے اور اس امید کی شکست حزن وغم کو ضروری طور پر پیدا کرتی ہے۔ اس سے ضرر کا اندیشہ تمہارے سینہ کو خوف سے بھر دیتا ہے جوں ہی تم نے اس بت کو توڑا اور حق تعالیٰ کی اس تنبیہ کو یاد کیا۔

وَلَا تَدْعُ مِنْ دُونِ اللّٰهِ مَا لَا يَنْفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ فَإِنْ فَعَلْتَ فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّالِمِينَ (پ ۱۱ ع ۱۶)[1]

غیر اللہ کی ربوبیت تمہارے قلب سے فنا ہو گئی۔ نفع کی امید، ضرر کا خوف تمہارے سینہ سے جاتا رہا اور حزن وخوف سے تم نے ہمیشہ کے لئے نجات پائی۔

إِنَّ الَّذِينَ قَالُوا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ (پ ۲۶ ع ۲)[2]

ربوبیت پر جہاں تم نے استقامت پیدا کر لی کہ دنیا اور زندگی کے متعلق تمہارا سارا نقطۂ نظر بدل گیا، نقطۂ نظر کا بدلنا تھا کہ زمین و آسمان بدل گئے ہے

چوں برخیزد خیال از چشم احول — زمین و آسماں گردد مبدل

بلکہ وہم تھا خیال تھا جس نے تمہیں خوف وحزن کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا، اب تم نے اس خیال کی تصحیح کی ذہنی صحت تمہیں حاصل ہوئی نور کی

---

[1] اللہ کے سوا کسی کو مت پکار ایسے کو کہ نہ بھلا کرے تیرا اور نہ برا پھر اگر تو ایسا کرے تو تو اس وقت ہو جائیگا ظالموں میں۔
[2] مقرر جنہوں نے کہا کہ رب ہمارا اللہ ہے پھر ثابت قدم رہے تو نہ ڈر ہے ان پر اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

طرف تم نے اپنا منہ کرلیا اور تمہاری روح اسپنے خالق وحاکم کو مخاطب کرکے چیخ اٹھی۔

"اللھمّ اسلمتُ نفسی الیک ووجھتُ وجھی الیک وفوضتُ امری الیک والجاتُ ظھری الیک رغبۃً ورھبۃً الیک لا ملجأ ولا منجأ منک الا الیک"[۱]

اے خدا میں نے اپنی جان تیرے سپرد کی، اپنا منہ تیری طرف کیا، اپنے کام تیرے حوالہ کئے اپنی پیٹھ تیرے سامنے جھکائی تیرے فضل کی امید میں اور تیری ناراضی سے ڈرکر، میری پناہ اور نجات کا مرکز تو ہی ہے۔" اس اقرار ربوبیت کے ساتھ ہی تم نے اپنے قلب میں طمانیت وراحت محسوس کی اعتماد ویقین نے خفتہ قوتوں کو جگایا، سارا عالم تمہیں نفع وضرر سے خالی، تمہارے ساتھ تعاون عمل کے لئے تیار، تمہارا رفیق وخادم نظر آنے لگا، زندگی کے راستہ میں تمہارے قدم بے باک انداز میں اٹھنے لگے، تمہارا سینہ کینہ سے پاک ہوگیا کیونکہ تمہارا یہ وہم دور ہوگیا کہ سوائے حق تعالیٰ کے ضرر اور نقصان پہنچانے والا درحقیقت دوسرا کوئی ہوسکتا ہے، جو اس کی آنکھ جس کو دشمن بے رحم سے کہہ رہی تھی ایمان کی آنکھ اس کو حق تعالیٰ کا فرستادہ بتلارہی ہے اور سعدیؒ کے پراثر الفاظ میں کہہ رہی ہے۔

چوں دشمن بے رحم فرستادہ اوست　　　　بدعہدم اگرنہ دارم ایں دشمن دوست

اسی وقت غیظ وغضب سے ہی تمہارا نفس پاک ہوگیا، دوست پر غضب کیسا اس یقین کے بعد کہ ہر آفت ہر مصیبت سیرت کے کسی نقص کو رفع کرنے آتی ہے، عالم حقیقی کے طرف سے ایک تنبیہ ہے جو ہمیں اپنے نقایص وذمائم کی طرف متوجہ کرتی ہے، انکی اصلاح کا موقع دیتی ہے، ہم کو ظلمت سے نکالتی اور نور کی طرف ہمارا رخ پھیردیتی ہے، حق تعالیٰ سے جوڑتی اور نفس وشیطان سے توڑتی ہے۔ ہاں پھر اس یقین واذعان کے بعد ہمارا سینہ غیظ وغضب کا محل کیسے بن سکتا ہے۔

اور ریا جو خلق کے لئے اپنے اعمال کی تزئین ہے، اسی وقت ممکن ہے کہ جب خلق

---

[۱] یہ اس حدیث کے الفاظ ہیں جو صحاح ستہ میں موجود ہے روا ہ البخاری عن البراء بن عازب رسول اللہ صلعم سوتے وقت آخری چیز یہ پڑھتے تھے

کو نافع و ضار سمجھا جائے، خلق سے توقعات وابستہ نہوں یا ضرر کا اندیشہ ہو، اس وہم کے دور ہو جانے کے ساتھ ہی ریاکاری اور تصنع و نمائش کی جڑیں کٹ جاتی ہیں عمل صرف حق تعالیٰ ہی کیلئے جاری ہو جاتا ہے جو مقصود کیلئے نہیں ہوتا کیونکہ یہ بھی مخلوق ہیں اور مخلوق سے نہ راحت ہے اور نہ سرور و مسرت اور نہ یہ مقصود بالذات ۔

کذب یا دروغ بافی کا محرک یا تو نفع کا حصول ہوتا ہے یا ضرر کے دفع کا خیال، یا پھر خود بینی، خودستائی، کبر و فخر و عجب و ریا۔ ہم نے اوپر دیکھا کہ ربوبیت حق ان جذبات ذمیمہ کا استیصال کس خوبی سے کر سکتی ہے، اسی لئے موحد کا قلب صداقت کا خزینہ ہوتا ہے، وہ وعدوں کا پکا، قول کا سچا ہوتا ہے۔ الموفون بعہدھم اذا عاھدوا[۱] کا مصداق ۔

اسی طرح غیبت شرک فی الربوبیت کا نتیجہ ہے۔ غیبت کی وجہ یا تو عداوت ہوتی ہے جس کا محرک نقصان و ضرر کا اندیشہ ہوتا ہے یا حسد یا محض کذب سے حاصل ہونے والی شیطانی لذت، ربوبیت کا صحیح علم اور اس پر یقین ان تمام ذمائم کی سب سے بے خطا دوا ہے جیسا کہ ہم نے اوپر ثابت کیا۔ غیر اللہ کو حقیقی نافع و ضار قرار دے کر ہم عداوت و بغض و حسد میں مبتلا ہوں اور غیبت نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتی ہے، خود آفریدہ التباس کو صحت علمی نے دفع کر دیا اور ان ذمائم کی گرفت سے قلب کو نجات ملی!

غرض تزکیہ نفس و تصفیہ قلب یعنی سیرت سازی کے لئے سب سے پہلے شرک فی المعبودیت اور شرک فی الربوبیت کی بیخ کنی ضروری ہے۔ لا کی شمشیر سے مالکیت، حاکمیت اور ربوبیت ذوات خلق سے کاٹ دی جاتی ہے اور الّا سے اسکا اثبات ذات حق میں کیا جاتا ہے اور اس طرح اخلاق الہیہ سے آراستہ ہونے کی قابلیت اور استعداد پیدا کی جاتی ہے اب مجاہدہ اور عمل اس مقصود کے حصول کے لئے ضروری ہیں اس کی توضیح میں چند مقامات کا پیش نظر رہنا لازمی ہے ۔

ابتدا میں ہم نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ علم ہی سے عمل پیدا ہوتا ہے لیکن علم سے

---

[۱] پورا کرنے والے اپنے اقرار کے جب عہد کریں (پ ۲ ع ۶)

مراد محض نظری علم نہیں لینا چاہیئے جو کانوں کی راہ سے داخل ہوتا ہے لیکن قلب میں جاگزیں نہیں ہوتا، اس لئے عمل کی صورت میں نمایاں ہونے کی قوت نہیں رکھتا اور اس لئے سنت بخش نہیں ہوتا[1]۔ علم سے ہماری مراد وہ یقین و اذعان ہے جو قلب کی گہرائیوں میں اپنا مسکن بناتا ہے خون کی طرح تمام رگوں میں دوڑتا ہے۔ دماغ پر کامل تسلط رکھتا ہے اور لازماً عمل کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ ایسا یقین تفکر و تدبر یا مراقبہ سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لئے تفکر کو عبادت سے افضل قرار دیا گیا ہے[2]۔ تفکر و مراقبہ سے علم راسخ ہوتا ہے[3] مضبوط ہوتا ہے تلوین جاتی ہے، تمکین رونما ہوتی ہے اور راسخ عقیدہ ہی عملاً اپنا خارج میں ظہور کرتا ہے، جب عمل کی تکرار ہوتی ہے تو عادت پیدا ہوتی ہے جو فطرت ثانیہ کہلاتی ہے۔ اب عمل کے لئے فکر و غور کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ غیر شعوری نفس عمل کی باگ اپنے ہاتھوں میں لے لیتا ہے مضایقت رفع ہو جاتی ہے سہولت پیدا ہو جاتی ہے۔ سیرت قائم ہو جاتی ہے اسی لئے کہا گیا ہے ع چند روز جہد کن باقی بخند

اب ہمیں سیرت سازی کے دوسرے اہم عنصر مجاہدہ یا عمل و عادت کی طرف توجہ کرنی چاہیئے۔

(۲) مجاہدہ: پاک سیرت جس طرح بغیر صحیح علم اور عقیدے کے ممکن نہیں اسی طرح بغیر عمل صالح اور مجاہدہ کے اس کی تمام خوبیوں کا نمایاں ہونا بھی ممکن نہیں۔ اسی لئے فرمایا گیا جَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ[4] اور صحیح عقیدہ مجاہدہ ہی کی چشم بصیرت افروز کے

---

[1] ایسے علم سے استعاذہ کیا گیا ہے اعوذ بک من علم لا ینفع ومن قلب لا یخشع [2] تفکر ساعۃ خیر من عبادۃ سبعین سنۃ الدیلمی وروی ابو الشیخ من حدیث ابو ہریرہ [3] قل انی اعظکم بواحدۃ ان تقوموا للہ مثنی وفرادی ثم تتفکروا (۲۲ ع ۱۲) سے تفکر کا حکم صاف طور سے سمجھ میں آتا ہے۔ (پ ۱۷ ع ۱۷) [4] مجاہدہ کرو اللہ کے واسطے جیسا کہ چاہیئے اس کے واسطے مجاہدہ کرنا۔

سامنے نیکیوں کی تمام راہیں کھول دی جاتی ہیں والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا[1]
اب ہمیں مجاہدہ کی اہمیت اور اس کے طریقوں کو سمجھ لینا چاہیے ۔

ذرا اپنے ذہن کے نہاں خانہ کو تو دیکھو کہ یہ ایک لحظہ خیالات ، تصورات ، خواطر اور وسواس سے خالی بھی رہتا ہے ؟ علم کا ایک دریا ہے کہ امڈا چلا آرہا ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک لاتنا ہی مبدء سے نکل رہا ہے ۔ اس کی ماہیت و نوعیت پر غور کرو تو ظاہر ہوتا ہے کہ اخلاقی نقطۂ نظر سے یہ یا تو ہدایتی علم ہے یا اضلالی علم کی آمد کسی طرح سے رد کی نہیں جاسکتی ۔ کون سی قوت اس کو روک سکتی ہے ؟ کسی خیال کو محض ارادے کی قوت سے پیدا نہ ہونے دینا بشری طاقت سے باہر ہے خیالات آزادی کے ساتھ ایک نامعلوم منبع سے ظہور کرتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسان ان کے پیدا کرنے پر قادر ہے اور نہ ان کے فنا کرنے پر لیکن انسان کو اتنی طاقت دی گئی ہے کہ اپنی توجہ اضلالی علم کی طرف سے ہٹا کر ہدایتی علم کی طرف مبذول کرے یا نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیالات کو ایجابی خیالات میں بدل دے یہی مجاہدہ کی ماہیت ہے ذہن میں سلبی یا اضلالی خیال غیر اختیاری اضطراری طور پر پیدا ہو رہا ہے اب یہ میرے اختیار میں ہے کہ میں اس خیال کو گلے سے لگاؤں ، پیار کروں ، قلب کے میدان میں تخت بچھاؤں اور اس کو معزز مہمان کی طرح عزت و وقار سے بٹھاؤں یا یہ کہ اس کے ذہن کے دروازہ سے سر نکالتے ہی اس کے مقابل ہدایتی یا ایجابی خیال کو اس کی سرکوبی کے لیے لے آؤں اور نور کی قوت کو ظلمت کی طاقت سے لڑادوں ظاہر ہے نور و ظلمت کے مقابلہ میں نور ہی کامیاب ہوگا کیونکہ ظلمت نور ہی کے غیاب کا تو نام ہے ، نور ہی کے عدم سے ظلمت پیدا ہوتی ہے ، جہاں نور ہو وہاں ظلمت کیسے جا سکتی ہے ؟ مجاہدہ حق تعالیٰ ہی کی حول و قوت سے اضلالی علم کے بجائے ہدایتی علم پر عمل کرنے کا نام ہے

---

[1] جنہوں نے ہمارے واسطے مجاہدہ کیا ہم ان کو اپنی راہیں سجھاویں گے ۔

اضلالی خیالات کے ذہن میں خطور کرتے، نبی مجاہد کی روح خیر کے مبدء کی طرف استغاثت کے لئے متوجہ ہو جاتی ہے۔ استعاذہ کرتی ہے، پناہ مانگتی ہے، اپنی محدود قوت پر بھروسہ نہیں کرتی، اپنی بیچارگی سے واقف ہوتی ہے لامتناہی قوت کے آستان پر تیزی کے ساتھ پہنچ جاتی ہے اور چیخ اٹھتی ہے :-

سبحان ذی الملک والملکوت سبحان ذی العزۃ والجبروت

سبحان الحی الذی لایموت اعوذ بعفوك من عقابك واعوذ

برضاك من سخطك واعوذ بك منك جل وجهك [۱]

اور یہ لامتناہی عزت وجبروت یہ لامحدود ملک وملکوت والا آقا ہم سے دور تو نہیں وہ وجود بالذات ہے جہاں میں موجود ہر جگہ" ہمارے پاس ہی تو ہے، رگ جاں سے زیادہ قریب ہے" باما نزدیک تر"! واالغیاث کی اس پکار پر شان رحمت کے ساتھ متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کی تجلی کے ساتھ قلب کی ضرر واضلال سے پوری حفاظت ہو جاتی ہے! نفسیاتی اصطلاح میں یوں کہو کہ سلبی خیال کی جگہ ایجابی خیال لے لیتا ہے اور شر کا صدور ہی نہیں ہونے پاتا۔

نفسیات کے اس مسلمہ قانون کو یاد کرو جس پر اس مقالہ کی بنیاد قائم ہے کہ افکار ہی سے اعمال کا صدور ہوتا ہے، اعمال ہی کی تکرار سے عادت کا قیام ممکن ہے اور عادات کی تنظیم وترتیب سے سیرت کی تشکیل ہوتی ہے۔ مجاہدہ سلبی یا بد یا اضلالی خیالات نے کتم عدم سے سر نکالا ان کے مقابل کے ایجابی یا نیک یا ہدایتی خیالات نے ان سے ٹکر لی۔ اپنی محدود وکم زور قوت سے ان کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ لامتناہی قوت وجبروت کے مبدء سے اخذ فیض کیا، اور اس طرح بے پناہ طاقت کے ساتھ ان پر ضرب لگائی اور ان کا قلع قمع کر دیا جب عمل ہی کا صدور اس طرح روک دیا گیا

---

[۱] یہ انہی حدیث کے الفاظ ہیں جس کو حاکم نے عمرؓ سے روایت کیا ہے۔

اور ابتدا ہی میں روک دیا گیا تو تکرار کی نوبت ہی کہاں، عادت کا قیام کس طرح ممکن؟ اور سیرت بد کی تشکیل کا کیا ذکر! یاد رکھو کہ فاسد خیالات کو قوت اس وقت ملتی ہے جب وہ تخیل کے دروازے سے خانہ قلب میں داخل ہو جاتے ہیں اور یہ داخل اسی وقت ہو سکتے ہیں جب دربان قلب غفلت کی نیند سو رہا ہو۔ جو کسی نہ ہو ہشیار اور خبردار ہو، پھر اپنے حول و قوت سے ان کا مقابلہ کرنا چاہے اس صورت میں معلوم ہوتا ہے کہ ان کا زور مردافگن ہے! ان سے مقابلہ بچوں کا کھیل نہیں۔ بڑے سے بڑے پہلوان کو آسانی سے پچھاڑ سکتے ہیں ان کے داؤ پیچ سے بہادر سے بہادر بھی پناہ مانگتے ہیں ان سے مقابلہ کی ایک ہی صورت ہے ان کے ورود کے وقت ہی انہیں پچھاڑ دیا جائے، سنبھلنے کا موقع ہی نہ دیا جائے اور حق تعالیٰ کی حول و قوت سے ان کا سامنا کیا جائے، اللھم اعذنی من شر نفسی[1] کی فریاد فوراً بلند ہو، اعوذ بک منک کی چیخ نکلے پھر شکست ناممکن ہے، کامیابی قطعی ہے، حق تعالیٰ کی پناہ میں آکر مغلوبیت کیا معنی رکھتی ہے ناکامیابی کیا چیز ہے حق کی معیت کے ساتھ ہی بلندی نصیب ہوتی ہے انتم الاعلون واللہ معکم[2] کا وعدہ پورا ہو جاتا ہے!

یہی نفسیاتی الٰہیاتی طریقہ بد عادات کی شکست میں بھی کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جا سکتا ہے بد عادت سے مراد کوئی عادت جو ہمارے اختیار و تصرف میں نہیں۔ بد عادت کی غلامی تباہ کن نتائج پیدا کرتی ہے۔ بد عادت کا غلام دنیا میں نہ کامیاب ہو سکتا ہے اور نہ برد قلبی اس کو نصیب ہو سکتی ہے چونکہ افعال ہی کی تکرار سے عادت بنتی ہے اور افعال کا محرک ہمیشہ خیال یا تصور ہوتا ہے

---

۱ اے اللہ میں اپنے نفس کے شر سے تیری پناہ مانگتا ہوں ۲ تم ہی غالب رہو گے اور اللہ تمہارے ساتھ ہے (۲۶ع ۸)

لہذا بد عادت کی شکست خیال کی تبدیلی پر منحصر ہے۔ عادت کے قائم ہو جانے پر فعل کے ارتکاب کی ایک طبعی خواہش ہوتی ہے لیکن ساتھ ہی اس خواہش کی تکمیل کا خیال پیدا ہوتا ہے ممکن ہے کہ خواہش پر ہمارا قابو نہ ہو لیکن خیال ہمارے تصرف میں آسکتا ہے۔ اگر خیال کا صحیح طریقہ سے مقابلہ کر لیا جائے تو خواہش بھی مغلوب ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر شرابی کی حالت پر غور کرو۔ اس کو شراب کی خواہش ہوتی ہے۔ اور یہ خواہش خیال پیدا کرتی ہے کہ چل کر پینا چاہیے۔ خیال کا کامیابی سے مقابلہ کرنے پر خواہش کے اشتداد میں کمی ہو جاتی ہے۔ ایک مرتبہ کا مقابلہ دوسری دفعہ کے مقابلہ کو آسان تر بنا تا ہے اور مجموعی نتیجہ حیرت خیز ہوتا ہے۔ یہی معنی ہیں اس قول کے کہ "خدا ان لوگوں کی مدد کرتا ہے جو اپنی مدد آپ کرتے ہیں"۔

بہر طور بری عادتوں کے آہنی پنجوں سے رہائی اسی وقت ممکن ہے کہ خیال کے پیدا ہوتے ہی اس کا مقابلہ کیا جائے اور اسی طریقہ سے مقابلہ کیا جائے جس کا اوپر ذکر ہوا اگر اس کے باوجود ہمیں ناکامی کی صورت دیکھنی پڑے تو ہمیں مایوس اور نا امید نہیں ہونا چاہیے۔ مجاہد کے نزدیک یاس کفر ہے گناہ کے ارتکاب کے بعد یا عادات بد کا ایک مرتبہ باوجود عزم راسخ کے کہ ایسا ہوگا شکار بننے کے بعد جو ندامت اس کے دل میں پیدا ہوتی ہے جو حزن و ملال کہ وہ محسوس کرتا ہے وہ اس کے ارادوں کو مضبوط کرنے میں غیر محسوس طریقہ پر مفید ہوتے ہیں اور وہ وقت بہت جلد آپہنچتا ہے جب وہ محض اسی طریقہ پر عمل پیرا ہو کر فاتحانہ شان سے اپنی خود ساختہ بیڑیوں کو توڑ کر ہمیشہ کے لئے آزاد ہو جاتا ہے۔ عارف رومی نے مجاہدہ کے اس اعتبار کو خاص انداز میں بڑی خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے:۔

اندریں رہ می تراش و می خراش　　تا دم آخر دمے فارغ مباش
تا دم آخر دمے آخر بود　　کہ عنایت با تو صاحب سر بود

دوست دارد دوست این آشفتگی | کوشش بیہودہ بہ از خفتگی!
کارکے کن تو دکاہل مباش | اندک اندک خاک چہ را می تراش
چوں زچاہے می کنی ہر روز خاک | عاقبت اندر رسی در آب پاک!
چوں نشینی بر سر کوے کسی! | عاقبت بینی تو ہم روے کسے!

بہر حال مجاہدہ ہمت ۔ سے کام لینا ہے حق تعالیٰ نے اس کو جو اختیار دے رکھا ہے اس کو استعمال کرتا ہے اور عزم راسخ رکھتا ہے کہ جب تک کہ ہر مقصود! تھہ نہ آئے قلب کا تزکیہ ۔ روح کا تجلیہ نہ ہو جائے وہ دم نہ لے گا اور حق مجاہدہ ادا کریگا ۔ دلولہ انگیز طریقہ سے ہر قدم پر وہ یہ گنگناتا جاتا ہے :-

دست از طلب ندارم تا کار من برآید | یا تن رسد بجاناں یا جان زتن برآید

کامیابی و فتمندی اس مجاہد کے ! تھ چوتی ہے کان حقاً علینا نصر المومنین کا وعدہ اس سے متعلق ہوتا ہے ؛ ہدایت کے راستے کھل جاتے ہیں لنھدینھم سبلنا کا قول پورا ہوتا ہے ۔

مجاہدہ بیوی بچوں کا چھوڑنا ، راتوں میں کم سونا ، فاقہ پر فاقہ کرنا ، حقوق نفس کو تلف کرنے کا نام نہیں ۔ مجاہدہ حقوق نفس کا ادا کرنا ہے اور غیر شرعی حظوظ نفس کا ترک کرنا ہے ، مجاہدہ قلب کا تصفیہ ہے ، روح کا تجلیہ ہے اس کا بہترین طریقہ خیالات فاسدہ کا دماغ سے تخلیہ ہے ۔ جو شخص اپنے قلب و دماغ میں فاسد خیالات کے بجائے پاک خیالات کو ، سلبی افکار کے بجائے ایجابی افکار کو جگہ دیتا ہے وہ اعمال سئیہ کا دروازہ بند کر دیتا ہے ! اس کے لئے امتثال امور اجتناب محظور اور رضا بقدر آسان ہو جاتے ہیں جو عارف اعظم شیخ عبد القادر جیلانیؒ کے الفاظ میں دین کا خلاصہ ہیں [1]

[1] فتوح الغیب مقالہ اول

ایجابی خیالات میں سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے جو سرچشمہ ہیں تمام محامد و محاسن کا، تمام خوبیوں اور نیکیوں کا، جو مبدء ہیں طمانیت و سرور کا علو و بالیدگی کا، قوت و عزت کا۔ اگر تم اپنے قلب کو تمام سلبی خیالات سے خالی کر کے حق تعالیٰ کے خیال کو اس میں جمانے کی کوشش کرو گے تو چند روز میں پاؤ گے کہ یہ تمام صفات مقبد پیمانہ میں تم میں خود ظاہر ہو رہی ہیں۔ نفسیات کا یہ عام قانون ہے کہ آدمی جس چیز کے خیال اور دھن میں رہتا ہے رفتہ رفتہ اس کی خو بو اس میں پیدا ہونے لگتی ہے۔ یا نفسیاتی زبان میں یوں کہو کہ اس کا جو معبود فکر ہوتا ہے وہی وہ بھی بنجاتا ہے! اس قانون کو جان کر اور مان کر تم ہرگز سلبی خیالات پر فکر و توجہ کو زیادہ مرکوز نہ کرو گے ایجابی خیالات ہی کو جمانے اور بسانے کی کوشش کرو گے اب ہم عارف روم کے الفاظ میں پوچھتے ہیں کہ حق تعالیٰ سے بہتر کوئی اور چیز ہو سکتی ہے جس سے تم ایک لحظ کے لئے حقیقی شادی خوش میں رہ سکتے ہو؟

کیست زو بہتر بگو اے ہیچ کس — تا بداں دل شاد باشی یک نفس

اگر تمہیں چشم بصیرت ملی ہے اور تم عارف روم کے ساتھ اتفاق کرتے ہو تو پھر کیا حق تعالیٰ سے بہتر اور کسی کی دھن ہو سکتی ہے؟ اب دن کا زیادہ حصہ اس دھن میں گذارو، گفتار کو چھوڑ کر اسی کار بزرگ میں لگ جاؤ رفتہ رفتہ جامی سامی نے جو کہا تھا اس کا تم کو تحقق ہونے لگے گا ؎

گر در دل تو گل گزرد گل باشی — ور بلبل بیقرار بلبل باشی

تو جزوی و حق کل است روزے چند — اندیشہ کل پیشہ کنی کل باشی

جو چیز تم کو خود تجربہ سے معلوم ہو جائے گی اس کا ذکر ہم کیا کریں لیکن تحریص کے لئے اتنا کہنا کافی ہے کہ تم پر سرور اور فرحت کے دروازے کھل جائیں گے، اطمینان قلب

جو دنیا کی کسی چیز سے حاصل نہیں ہو سکتا، منقود ہو گا اور اس آیۂ کریمہ کا اپنی ذات کو مصداق پاؤ گے۔

یا ایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی ہ

نفسِ مطمئنہ کا حصول رضائے الٰہی کا تحقق رحمت ذات میں دخول یہ نتائج ہیں اس مجاہدہ کی تکمیل کے؛ جو لذت کہ حق تعالیٰ کی یاد میں ہے جو مستی اس کی یاد و شہود سے حاصل ہوتی ہے اس کے مقابلہ میں لذت جہاں ہیچ ہیں جامی اس دیا مستی کو اس والہانہ انداز سے ادا فرماتے ہیں:۔

کا ے بلبل جان مست بیاد تو مرا ... وے پایۂ غم پست بیاد تو مرا
لذات جہاں را ہمہ در پا فگند ... ذوقیکہ دہد دست بیاد تو مرا

خدا تعالیٰ کی یاد کا ایک طریقہ تو یہ ہے کہ اس کا ذکر زبان پر جاری رہے، فَاذْكُرُوا اللّٰهَ ذِكْرًا كَثِيرًا پر عمل ہو۔ اٹھتے بیٹھتے یہی مشغلہ ہو اور اس سے مقصود رضا و قرب الٰہی ہو۔ جب تمہاری توجہ ذکر کی وجہ سے خرافات دنیوی سے ہٹ کر ایک نکتہ پر مرکوز ہو گی تو خود بخود فاسد سفلی، پریشان کن خیالات اور وساوس کا دروازہ بند ہو جائیگا اور جوں ہی خیالات کی یہ پراگندگی موقوف ہوئی ایک روحانی کیف و طمانیت سے تمہارا قلب مملو ہو جائیگا۔ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوبُ ۔ کے یہی معنی ہیں۔ ذکر کا قیام مشق اور مجاہدہ سے آہستہ آہستہ ہوتا جاتا ہے۔ اس دولت کے حاصل ہو جانے کے بعد تم تمام چیزوں سے غنی ہو جاتے ہو، نہ کسی چیز کے حصول سے تمہیں لذت ہوتی ہے اور نہ کسی چیز کے ضائع ہونے سے رنج لکیلا

لہ (پ ۳۰ ع ۱۴) اے وہ جی جس نے چین پکڑ لیا پھر چل اپنے رب کی طرف وہ اس سے راضی وہ تجھ سے راضی۔ پھر شامل ہو میرے بندوں میں اور داخل ہو میری بہشت میں۔

تاسوا علی مافاتکم ولا تفرحوا بما آتاکم کے مصداق ہونے لگتے ہو، اللہ کو رکھ کر تمہیں
کسی چیز کی خواہش نہیں ہوتی۔ تم عارف روم کے الفاظ میں کہنے لگتے ہو۔

روزہا گر رفت گو رو باک نیست
تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست

یاد کے قائم کرنے کا ایک اور آسان گر ہم تمہیں بتلاتے ہیں۔ یہ تو تم مانتے ہو کہ ہر شئے کے خالق حق تعالیٰ ہیں، شئے انکی مخلوق ہے ہمارا رات دن سابقہ ان ہی اشیاء سے ہوتا ہے یہی ہمارے دل اور دماغ میں بسی ہوئی ہیں ان ہی کی محبت سے ہمارے قلوب بھرے ہوئے ہیں چونکہ یہ فانی اور گریز پا ہیں ان کا زوال اور ان کی فناپذیری ہمارے غم وحزن کا باعث ہوتی ہے اب قانون اتلاف ذہنی کی رو سے یہ ممکن ہے کہ مخلوق کو دیکھ کر خالق کی طرف ذہن منتقل ہوجائے تم بھی کوشش کرتے رہو کہ شئے کو دیکھ کر تمہارا خیال شئے کے خالق کی طرف جائے اس طرح تمہیں ہر طرف حق تعالیٰ ہی کا جلوہ نظر آئیگا اور اینما تولوا فثم وجہ اللہ کے معانی کا ابتدائی فہم حاصل ہونے لگیگا۔ شئے کی سلبی بہت سے توجہ ہٹ کر جہت حق کی طرف مرکوز ہوجائے گی اور اس طرح یاد قائم ہونے لگے گی تمہارا معروض فکر اب شئے نہیں حق ہوگا اور ان تمام انوار سے تمہارا قلب معمور ہونے لگیگا جو وجہ اللہ کی طرف رخ کرنے سے حاصل ہوتے ہیں۔

اس طریقے سے تمہیں بہت جلد معلوم ہوجائیگا کہ سعادت ومسرت کا سرچشمہ خود ہمارا قلب ہے، حق تعالیٰ کا جلوہ گاہ خود ہمارا قلب ہے۔ آفاق میں حق تعالیٰ ظاہر ہیں ہر شئے کے ساتھ جہت حق موجود ہے صحیح علم کے استعمال سے وہم اور التباس دور ہوا اور نظر کی اصلاح ہوئی۔ نقطۂ نظر بدلا معلوم ہوا کہ نفس وآفاق میں حق تعالیٰ نہاں وعیاں ہیں، ان ہی سے تعلق قائم کرنا، ان ہی کی یاد کا جمانا

تمام مسرتوں اور سعادتوں کا حاصل کرنا ہے، ان سے غفلت اور دنیا و خلق میں مستغرق اور منہمک تمام بلاؤں اور آفتوں میں گرفتار ہونا ہے۔ مَنْ یُعْرِضْ عَنْ ذِکْرِ رَبِّهٖ یَسْلُكْهُ عَذَابًا صَعَدًا جو کوئی اپنے رب کی یاد سے منہ موڑتا ہے اسے سخت عذاب میں ڈال دیا جاتا ہے۔ (پ ۲۹ ع ۱۱) اسی مفہوم کو رومی کے دلنشین الفاظ میں سن کر یاد رکھو۔

گر گریزی بر امید راحتے
ہم ازاں جا پیشت آید آفتے

ہیچ کنجے بے دد و بے دام نیست
جز بخلوتگاہ حق آرام نیست

حق تعالیٰ کو چھوڑ کر خلق میں محویت خواہ بظاہر وہ کیسی ہی دلفریب اور دلکش نظر کیوں نہ آئے، نور کو چھوڑ کر ظلمت میں گرفتار ہونا ہے اور ظلمت سے ضیق، غم و حزن و خوف کے سوا اور کیا حاصل ہوتا ہے۔ ظلمت میں چیزیں اپنے صحیح خط و خال میں کہاں نظر آتی ہیں! کسی شئے کا حسن و جمال تاریکی میں کیا دکھائی دیگا! پھر تمہاری نظر میں اشیاء کی یہ دلفریبی تمہارے نفس کا دھوکہ ہے، التباس ہے، تمہارا وہم ہی تو خلاق ہے، کیسی کیسی دلربا صورتیں یہ تمہاری خوشی کے لئے پیدا کرتا ہے۔ ان سے تمہیں ابھی لذت حاصل ہوتی ہے۔ تھوڑی ہی دیر بعد غم کا سایہ تمہارے قلب پر چھا جاتا ہے، ابھی اعتماد ہوتا ہے ذرا دیر بعد خوف کا زبردست حملہ ہوتا ہے اور تم کانپ اٹھتے ہو! تمہاری طبیعت میں استقلال نہیں استحکام نہیں، تمہاری کوئی پناہ گاہ نہیں! اگر تم اپنی غفلت سے جاگ اٹھو، اگر تمہاری چشم بصیرت کھل جائے اور نور اور صداقت کی دنیا نظر آنے لگے تو تمہیں اشیاء ویسی ہی دکھائی دینے لگیں گی جیسی کہ وہ ہیں اب تم کو حیات طیبہ نصیب ہوگی، طمانیت و برد قلبی حاصل ہوگی۔ خوف و حزن زائل ہو جائیگا، استقلال و استحکام عطا ہوگا اور حق تعالیٰ کے اس وعدہ کا ایفا ہوگا۔

مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً ؕ [1]

(پ ۱۴ ع ۱۹)

۔۔۔ یہ چیز کو قائم کرنے، تمہارا رخ ظلمت سے نور کیطرف پھیرنے، مجاہدہ کے راستے کو آسان کرنے خلق سے توڑنے اور حق سے جوڑنے میں نیکوں کی صحبت عجیب و غریب اثر رکھتی ہے صحبت کا اثر نفسیات کا ایک مسلمہ اصول ہے کہ [2] ہر فرد میں بے سوچے سمجھے ہر قسم کے قضایا کو قبول کرنے کی استعداد یا صلاحیت پائی جاتی ہے، جب یہ قضایا خود اپنے ذہن کے اندر سے وصول ہوتے ہیں تو اسکو جدید نفسیات کی اصطلاح میں "خود ایعازی (auto-suggestion) کہا جاتا ہے اور جب کسی خارجی ذریعہ سے حاصل ہوں تو غیر ایعازی (hetero-suggestion) کہا جاتا ہے۔ رات دن ہم خود ایعازی اور غیر ایعازی کے اثر کے تحت خیالات کو قبول کر رہے ہیں اور ان کو جزو ذہن بنا رہے ہیں اگر سلبی و ضلالی افکار غیر ایعازی قوت کی وجہ سے ہمارے قلب میں جگہ پا رہے ہیں تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم بری صحبت میں ہیں اور ان کے تنفسات و افعال کی نقل کر رہے ہیں یا اضطراری طور پر ان سے متاثر ہو رہے ہیں ان کے سمی اثرات سے بچنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم صحبت ناجنس سے احتراز کریں ؎

زاحمقاں بگریز چوں عیسیٰ گریخت　　صحبت احمق بسے خونہا ریخت

---

[1] جس نے نیک کام کیا مرد ہو یا عورت اور وہ ایمان پر ہے تو ہم اس کو زندگی دینگے ایک اچھی ستھری زندگی

[2] و مثل جلیس الصالح کمثل صاحب المسک ان لم یصبک منه شیء اصابک من ریحه و مثل جلیس السوء کمثل صاحب الکیر ان لم یصبک من سواده اصابک من دخانه (ابوداؤد و نسائی عن انس) نیک ہمنشین کی مثال مشک والے کی سی ہے اگر تجھے اس سے کچھ نہ ملے تو خوشبو تو ضرور پہونچیگی اور برے ہمنشین کی مثال لوہار کی بھٹی یا بھٹے کی سی ہے اگر تجھ کو سیاہی نہ لگے تو دھواں تو ضرور پہنچتا ہے۔

سلبی اثرات سے اس طرح بچ کر ایجابی اور ہدایتی علم کے لئے نیکوں کی تلاش کرنی چاہیئے اہل اللہ کی زبان سے حاصل کیا ہوا علم اپنے اندر خاص اثر و قوت رکھتا ہے وہ قلب کی گہرائیوں تک پہنچ جاتا ہے یقین و اذعان کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔

علم حق کو شیخ اکبر محی الدین عربی نے علم اذواق قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں علم الحق علم الاذواق لا من الاوراق هو العلم الصحیح وما نداه فخدشات وتخمین لیس العلم اصلاً یعنی علم حق ذوق و وجدان سے حاصل شدہ علم ہے محض کتابوں سے حاصل کردہ نہیں اور یہی علم صحیح ہے باقی اٹکل پچو غیر معتبر ہے۔ شاید اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل اللہ کا علم قیاسی نہیں مبدء نبوت سے اخذ کردہ ہے قطعی واقعی ہے اس کو قبول کرنے اور اس پر عمل کرنے سے حق تعالیٰ خود ان کے معلم ہو گئے ہیں اور اب وہ براہ راست اسی مبدء سے علم حاصل کرنے لگے ہیں اتقوا اللہ ویعلمکم اللہ [1] اس پر دلیل ہے اس لئے ایک دوسرے راز داں کی نصیحت یہ ہے کہ خذ العلم بافواه رجال اللہ لا من الصحائف والدفاتر مردان حق کی زبان سے علم حاصل کرو کتابوں میں قیاس و تخمین ظن و رائے کے سوائے کیا رکھا ہے اہل اللہ کی صحبت خاک کو کیمیا کرتی ہے، ان کے اقوال و اعمال ان کے افکار و خیالات رفتہ رفتہ قلوب کے زنگ کو دھوتے جاتے ہیں اور تم غیر شعوری طور پر نیکی کی طرف مائل ہوتے جاتے ہیں اور بدی سے مجتنب و محترز ہو کر بالآخر ظلمت سے نکل کر نور کی طرف تمہارا منہ ہو جاتا ہے۔ عارف روم نے صحبت مردان حق کے اثرات کو یوں بیان فرمایا ہے:۔

خواہی کہ دریں زمانہ فردے گردی	یا در رہ دیں صاحب دردے گردی
ایں را بجز از صحبت مرداں مطلب	مردے گردی چو گرد مردے گردی۔۔

---

[1] اللہ سے ڈرو وہ تمہیں علم دیتے ہیں۔

یہ کونوا مع الصادقین کے حکم کے پنہاں فائدوں کی اجمالی توضیح ہے۔

سیرت سازی کے قرآنی اصول کی اوپر جو توضیح پیش کیگئی اس کو اجمالاً ایک دفعہ پھر دہرا لیجئے اذا تکرر تقرر تکرار سے چیزیں زیادہ دلنشین ہوتی ہیں۔ سیرت کی عمارت کا سنگ بنیاد لا الٰہ الا اللہ پر پختہ یقین و اذعان ہے، تمام انبیاء کا اپنی قوم کو یہی پیغام تھا کہ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ "اے قوم اللہ کی عبادت کرو ان کے سوا تمہارا کوئی الٰہ یا معبود و رب نہیں" اللہ ہی لائق عبادت ہیں استعانت ان ہی سے کیجانی چاہیئے میرا سر ان ہی کے سامنے جھک سکتا ہے۔ غیر کے سامنے نہیں میرا یہ ہاتھ ان ہی کے سامنے پھیل سکتا ہے کسی اور کے سامنے نہیں۔ اس بنیادی عقیدہ کا زبان سے اظہار اور قلب سے اقرار ضروری ہے۔ زبان سے بار بار کی تکرار یقین کو پختہ کرتی ہے جس قدر یقین میں پختگی ہوگی اسی قدر عمل میں سہولت ہوگی۔ یقین میں شدت پیدا کرنے کے لئے غور و فکر تدبر و مراقبہ ضروری ہیں۔ یقین اس شدت کا پیدا ہوجائے کہ شک و شبہ کی مطلقاً گنجائش نہ رہے تم جانتے ہو کہ آگ میں ہاتھ ڈالنے سے تمہارا ہاتھ جل جائیگا۔ اسی طرح تمہیں توحید فی المعبودیت و توحید فی الربوبیت کا یقین ہوجانا چاہیئے ذلت جو عبادت کی اصل ہے حق تعالیٰ ہی کے سامنے اس کا اظہار ہوسکتا ہے جو ہمارے [illegible] ہیں حاکم ہیں مولیٰ ہیں خالق ہیں رب ہیں، وکیل و نصیر ہیں۔ حق تعالیٰ ہی نافع و ضار ہیں معز و مذل ہیں حاجت و مراد ان کے سوا کوئی پوری نہیں کرسکتا اس لئے ان ہی کے سامنے دست سوال دراز ہوسکتا ہے کسی اور کے سامنے ہرگز نہیں زبان پر دعا جاری رہے اور قلب میں اس کا مفہوم متمکن ہو۔

اللّٰھم کما صنت وجوھنا ان نسجد لغیرك فصن

اَللّٰہُمَّ کَمَا صُنْتَ وُجُوْہَنَا عَنِ السُّجُوْدِ لِغَیْرِکَ فَصُنْ اَیْدِیْنَا اَنْ تَمْتَدَّ بِالسُّؤَالِ لِغَیْرِکَ

الٰہی جس طرح تونے ہمارے چہروں کو غیر کے آگے سجدہ کرنے سے بچایا اسی طرح ہمارے ہاتھوں کو تیرے غیر کے آگے سوال کرنے سے بچائے رکھیو۔

اس عقیدہ و یقین کا شخص اپنے ہم جنسوں کے آگے کیسے خود کو ذلیل کر سکتا ہے، اس کی سیرت غلاموں کی سی کیسی ہو سکتی ہے وہ نفع و ضرر کی توقع غیر اللہ سے کب رکھ سکتا ہے اور اپنی عزت اس وہمی نفع و نقصان کی خاطر کیسے بیچ سکتا ہے۔ مجاہدہ اسی یقین اساسی کو پختہ کرتا ہے اس کا طریقہ یہ ہے کہ خواطر کی نگہبانی کی جائے سلبی اور اضلالی علم کو ایجابی و ہدایتی علم سے بدلا جائے "قانون تقلیب افکار" (Law of the Polarisation of Thoughts) نفسیات کا ایک مسلمہ قانون ہے اسی قانون کے استعمال سے اضلالی علم ہدایتی علم میں مبدل کیا جا سکتا ہے نہ صرف یہ بلکہ ایجابی خیالات ہدایتی افکار کو ہمیشہ ذہن میں جمانے کی کوشش کرنی چاہیے اور سب سے زیادہ ایجابی خیال حق تعالیٰ کا خیال ہے جب قلب پر چھا جاتا ہے تو قلب تمام نعمتوں سے ایک ہو جاتا ہے نورانی بن جاتا ہے نور ہو جاتا ہے "اَللّٰهُمَّ اجْعَلْ فِیْ نَفْسِیْ نُوْرًا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْنِیْ نُوْرًا" کی دعا قبول ہو جاتی ہے۔ اس کا نتیجہ سرور و طمانینت ہے مسرت و سعادت ہے جو پاک سیرت کی لازمی خصوصیت ہے نیک سیرت شخص مسرور و مطمئن ہوتا ہے اس کی جان اس کا تن راحت میں ہوتا ہے۔ وہ قطرۂ نور ہوتا ہے غم سے فارغ اور دائما مسرور ہوتا ہے یہ روحانی مسرت ہے جو طبعی غم و حزن میں بھی باقی رہ سکتی ہے! اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ

ولا ہم یحزنون الذین آمنوا وکانوا یتقون لہم البشریٰ
فی الحیوۃ الدنیا وفی الآخرۃ لا تبدیل لکلمات اللہ ذلک ہو
الفوز العظیم (پ ۱۱ ع ۱۱)

ڈاکٹر میر ولی الدین



امام ابوحنیفہ کی تدوینِ قانونِ اسلامی

مختلف ملکوں کی تاریخ پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً ہر جگہ ابتداءً قبائلی رسم و رواج کا دور دورہ تھا اور کسی معاملے میں رواجی نظیر رہبری کے لئے موجود نہ ہوتی تو کسی معتمد علیہ اور فرزانہ پنچ سے رجوع کیا جاتا اور اس کا فیصلہ قانون کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ ہوتا تھا۔ کسی بستی کے بس جانے اور شہری مملکت کے قائم ہو جانے پر قبائلی وحدتوں کا رواج جلدی ہی سربرآوردہ قبیلے کے رواج میں ضم ہو جاتا ہے۔ اور اکثر ملکوں میں یہ رسم و رواج کسی بڑے سپہبر کی افسری کے زمانے میں تحریری صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اپنے کو حقیر سمجھنے کا جذبہ اور مرعوبیت بعد والوں کے لئے اس تحریری قانون میں جمود پیدا کر دیتے ہیں اور جب تک کوئی انقلاب انگیز بیرونی اثرات یا خود اس تحریری قانون میں ترقی کر سکنے کے لئے اندرونی لچک نہ رہی ہو تو جلدی ہی وہ قانون از کار رفتہ ہو کر طبعی موت مر جاتا ہے۔

ایک دوسرا رجحان اکثر ممالک میں یہ رہا ہے کہ ابتداءً جملہ شعبہ ہائے حیات چاہے وہ عبادات ہوں یا معاملات یا جرائم و جنایات، مذہبیت کی ہمہ گیر گرفت میں

جکڑے رہتے ہیں اور قانون دانی و عدل گستری پجاری کا اجارہ ہوتا ہے۔ گرفتہ رفتہ عبادت اپنے تقدس کے باعث غیر متبدل پذیر ہو جاتی ہے اور سیاست اپنے نت مختلف مسائل کے باعث روز افزوں صوابدید پر منحصر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اسی لئے مذہب اور سیاست میں دوری ہو جاتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ اسلامی قانون کا آغاز شہر مکہ سے ہوا۔ متعدد کاروانی راستوں کا اہم جنکشن ہونے کی وجہ سے یہاں کی آبادی میں یک نسلی باقی نہ رہی تھی۔ اسماعیلی خاندان عراق یا فلسطین سے آئے تھے۔ خزاعہ یمن کے تھے۔ مکے والوں کے رشتہ داری اور کاروباری تعلقات شہر مدینہ اور شہر طائف سے بھی کافی تھے۔ قصی کا تعلق شمالی عرب کے قبیلہ قضاعہ سے تھا۔ قصی کی کوشش اور قابلیت سے قریشی قبائل نے شہر مکہ میں سربرآوردہ حیثیت حاصل کی اور قصی ہی کی سرداری میں ایک زیادہ منضبط شہری مملکت قائم ہوئی جس میں مختلف مذہبی، سماجی اور انتظامی عہدے موروثی طور پر مختلف خاندانوں میں پائے جاتے تھے۔[1] جہاں تک قانون کا تعلق ہے، حجاز میں لکھنے پڑھنے کا رواج بہت کم رہنے کے باعث اسلام سے پہلے کسی تحریری مجموعے کا پتہ نہیں چلتا لیکن قانونِ معاہدہ اور قانونِ جرائم وغیرہ کے بہت سے رواجی احکام روایات نے محفوظ رکھے تھے حتیٰ کہ اجنبیوں کے حقوق کے تحفظ اور تصادم قوانین کے نفاذ کے لئے حلف الفضول کے نام سے ایک رضاکارانہ نظام بطور تہدید و تدارک وجود میں آگیا تھا۔ شہر مکہ میں اسی قصی کی اولاد میں سے حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے پیغمبر اسلام کی حیثیت حاصل فرمائی۔ مکہ "وادی غیر ذی زرع" ہے اس لئے

---

[1] تفصیل میں نے ایک الگ مضمون "شہری مملکت مکہ" میں دی ہے جو اسلامک کلچر میں ۱۹۳۸ء میں اور معارف اعظم گڑھ میں ۱۹۳۲ء میں چھپا ہے۔ دیکھئے شمارہ ۲

یہاں کے لوگ عام طور پر تجارت پیشہ ہی تھے تجارت اور کاروانی کاروبار کے سلسلے میں پیغمبر اسلام نے بھی عرب میں یمن اور عمان کا کافی طویل سفر کیا تھا اور عرب کے باہر کم از کم فلسطین جانے کا دو بار پتہ چلتا ہے ایک مرتبہ آٹھ نو سالہ نو عمری ہی میں ضد کر کے اپنے سرپرست چچا کے ساتھ اور ایک مرتبہ بطور خود پچیس سال کی عمر میں لکھنے پڑھنے سے ناواقف اُمّی ہونے اور یونانی، لاطینی اور سریانی زبانوں کے نہ جاننے کے باعث ہوئے قانون در رواج تجارت کو تیز نظری سے دیکھنے کے اس کی کم توقع کی جا سکتی ہے کہ فلسطین میں اس زمانے میں کسی اور چیز سے آپ نے دلچسپی لی ہو۔

بہر حال چالیس سال کی عمر میں حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو شہر کے ایک معزز گھرانے کے معزز رکن تھے اپنے متعلق خدا کے پیغام رساں ہونے کا اعلان فرمایا اور قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔

خدا کا جو پیغام آپ کو وحی کے ذریعے سے وصول ہوتا تھا اسے آپ فوراً ایک ترتیب سے لکھوا دیتے۔ اس کے مجموعے نے کتاب اللہ اور قرآن کا نام حاصل کیا۔ چونکہ پیغمبر اسلام نے قوم کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا تھا اس لئے قوم کے ہر شعبۂ حیات کے لئے اس میں رہنمائی کی گئی اور صرف ایک دنیاوی امور کے قانون ہی پر قرآن منحصر نہیں ہو گیا۔

قرآنی پیغام کی تشریح و توضیح اور اصلاح قوم کے سلسلے میں ملک کے بہت سے اچھے اور معقول قدیم رواجات کو آپ نے اپنے متبعین میں جو برقرار رہنے دیا یہ بھی قانون اسلام کا بہت بڑا ماخذ ہے خاص کر اس لئے بھی کہ خود قرآن نے متعدد جگہ اس کا صراحت سے حکم دیا ہے کہ پیغمبر اسلام کا ہر قول و فعل اور امر و نہی واجب التعمیل اور لائق تقلید ہے لیکن یہ سُنّت نبوی اس باقاعدہ اور

کمل طور سے تحریراً مرتب نہ ہو سکی جو قرآن کے متعلق ملحوظ رکھا گیا۔ یہ ظاہر ہے کہ سنتِ نبوی میں بھی صرف قانونی احکام نہیں ہیں بلکہ دیگر قسم کے امور بھی ملیں گے قانونی احکام کچھ تو قرآنی اجمال کی تفصیل و تکمیل پر حاوی تھے تو کچھ نئے اور زائد احکام تھے جو قرآن کے سکوت کے وقت دیئے گئے تھے اور کچھ ملکی اچھے رسم و رواج کے مختلف اجزا کو برقرار رکھنے پر مشتمل تھے پیش ہونے والے مقدمات کے فیصلے، روزمرہ نظم و نسق کا تذکرہ، حکام اور افسروں کو ہدایتیں، خصوصی خطبات و اعلانات، غرض بیسیوں قسم کی چیزیں سنت میں ملتی ہیں۔ دنیا کا کوئی قانون مباح امور کی فہرست مکمل نہیں کر سکتا۔ اچھا اور معقول نظامِ قانون اپنے چند بنیادی خصوصیات کو واجب اور ضروری قرار دے کر اور ممنوعات کی فہرست کو مکمل کر کے باقی تمام چیزوں کو روا[1] قرار دیدیتا ہے اور جن چیزوں میں بیک وقت متعدد حقوق قائم ہوتے ہیں ان کا تناسب بیان کر دیتا ہے اُحِلَّ لَكُم مَّا وَرَاءَ ذَالِكُمْ وغیرہ قرآنی آیتوں سے قانونِ اسلام میں بھی یہی اصول ملحوظ رہنا ہویدا ہوتا ہے؛ اِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ اِلَيْهِ، لَا يُكَلِّفُ اللهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا وغیرہ سے قانون میں لچک اور حالات کا ساتھ دینے کی قابلیت واجبات و ممنوعات کے متعلق بھی پیدا کر دی گئیں۔

---

[1] "روا" یا "مباح" کے معنے یہ نہیں کہ اسے ضرور کیا جائے بلکہ وہ ہر شخص کی صوابدید اس کے ذوقِ سلیم اس کی ضرورت اور اس کے خصوصی حالات پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ اور نہ صرف دو آدمیوں کے بلکہ ایک ہی آدمی کے دو مختلف اوقات کے طرزِ عمل میں ان کے متعلق اختلاف ہو سکتا ہے۔

لیکن بڑا اہم سوال آئندہ کی ترقی کا ہے کہ مستقبل میں پیدا ہونے والے نامعلوم اور ان گنت نئے مسائل سے دوچار ہونے پر کیا کیا جائے؟ اس بارے میں امام ترمذی وغیرہ نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک حدیث متعدد مآخذوں سے روایت کی ہے کہ جب آپ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو سرکاری افسر بنا کر روانہ کیا تو رخصتی باریابی میں حسب ذیل گفتگو فرمائی:-

اگر کوئی مقدمہ پیش ہو تو کس طرح فیصلہ کرو گے؟

جیسا کہ کتاب اللہ میں حکم ہے!

اگر کتاب اللہ میں صراحت نہ ہو تو؟

تو پھر رسول اللہ کی سنت کے مطابق!

اگر سنت رسول میں بھی نہ ملے تو؟

تو پھر میں اپنے رائے سے اجتہاد کروں گا!

تعریف اس خدا کو سزاوار ہے جس نے اپنے رسول کے فرستادے کو اس چیز کی توفیق دی جسے اس کا رسول پسند کرتا ہے۔

یہ مکالمہ تو کوئی کاغذی نظریہ بنا رہا اور نہ ہی کوئی انفرادی واقعہ تھا۔ اہم معاملات میں استصواب نگرانی اور تصحیح کی ناگزیر ضرورتوں کے ساتھ ساتھ وسیع صوابدید کا حق خود جناب رسالتمآب کی طرف سے افسران قانون کے لئے تسلیم کر لیا جاتا اور ایک دوسرے موقع پر انتم أعلم بامور دنیاکم (تم لوگ اپنے دنیاوی امور کو زیادہ بہتر جانتے ہو) ارشاد فرما کر اپنے خالص جہانبانی حکم کو منسوخ کر دینا ایک انقلابی لیکن فیصلہ کن نظیر تھی جس کے باعث اسلامی قانون کے مستقبل نے اپنے متعلق مکمل اطمینان حاصل کر لیا۔

عہد نبوی مسلمانوں کا دورِ قانون سازی تھا اس کے بعد تعبیر و توسیع

کا سلسلہ تو جاری رہا لیکن خالص قانونی احکام کا مجموعہ تیار کرنے کی کوئی سرکاری کوشش نہ ہوئی اگرچہ خلفا کی سرپرستی بلکہ خود ان کی خواہش پر بعض نجی مجموعے تیار ہوئے جن کی ایک مثال خود امام مالک کی موطا کا خلیفہ منصور کی خواہش پر مرتب ہونا ہے[1]

---

(۱) ابوحنیفہ کی علمیت کا معترف ہونے کے باوجود منصور (حکومت ۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ) کا ان کی جگہ امام مالک سے تدوینِ فقہ کی خواہش کرنا کچھ تو امام ابوحنیفہ کی پیرانہ سالی کے باعث ہوگا اور اس سے زیادہ ان کی سیاسی بے باکی و آزاد خیالی کے باعث عہد بنی امیہ میں وہ علانیہ انقلاب پسندانہ ہمدردیاں رکھتے تھے چنانچہ جب امام زید بن علی نے ایک سیاسی انقلاب کے لئے جدوجہد کی تو انہوں نے بہت بڑی رقم چندے میں دی تھی بنی عباس برسراقتدار آئے تو چندے صبر کیا پھر منصور کے خلاف ۱۴۵ھ میں بغاوت ہوئی تو انہوں نے علانیہ منصور کی برائی کی تھی۔ شاید امام مالک نے بھی ابتداءً منصور کی بیعت کے جبری اور بے اثر ہونے کا فتویٰ دیا تھا (سیرۃ النعمان شبلی ص ۵۹ تا ۶۱) لیکن صیمری نے (ص ۴۸ تا ۴۹) ایک اہم واقعہ لکھا ہے کہ منصور نے ابن ابی ذئب العامری اور امام ابوحنیفہ اور امام مالک تینوں کو بلا کر یہ سوال کیا تھا کہ ان کی رائے میں وہ خلافت کا اہل ہے یا نہیں ابن ابی ذئب اور ابوحنیفہ نے تو صاف صاف منصور کے کردار کی خامیاں برملا اس پر ظاہر کردیں لیکن امام مالک نے یہ دلچسپ انداز اختیار کیا۔

لو لم يرك الله أهلاً لذلك	اگر خدا تجھے اہل نہ سمجھتا تو وہ تجھے امت کے
ما قدّر لك ملك أمر الأمة	معاملات کا مالک بنانا طے نہ کرتا اور نہ امت سے
وأزال عنهم من بعد من نبيهم	ان لوگوں کی حکومت کو دور کرتا جو ان کے
	نبی سے [قرابت میں تجھ سے] زیادہ دور ہیں۔

اس ذومعنی فلسفیانہ جواب سے منصور کا اطمینان ہوگیا اس نے امام مالک کو انعام بھی دیا اور شاید اسی عمدہ تاثر کے باعث جب اسے بغاوتوں سے فراغت حاصل ہوئی اور ایک مجموعۂ قانون ملک کی ضرورت محسوس ہوئی تو اس نے امام مالک سے رجوع کیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ تدوین کی خواہش

(دیکھیے زرقانی کی شرح موطا کا مقدمہ) لیکن ان کو بھی سرکاری طور سے قانون ملک کے طور پر نافذ کرکے عدالتی و انتظامی افسران مملکت کو انھیں کا پابند کر دینے کی صورت پیش نہ آئی ایسے مجموعے صرف ایک درسی کتاب کی حیثیت حاصل کرسکے جن سے حسب ضرورت حکام عدالت وغیرہ بھی مدد لیتے تھے بہرحال ان خانگی کوششوں سے وہی مقصد حاصل کر لیا جو سرکاری اہتمام سے ممکن ہوتا اور کوشش کے خانگی ہونے سے آیندہ بھی خانگی علماء کی ہمتیں بلند رہیں جو تدوین کے سرکاری ہونے کی صورت میں اتنے درخشاں نتائج پیش نہ کرسکتیں ہمارے ایک فاضل بزرگ اس کی دوسرے الفاظ میں یوں تعبیر و توضیح کرتے ہیں کہ اسلام میں عہد نبوی کے بعد نہ صرف عدلیہ کو تنفیذیہ سے آزاد رکھا گیا بلکہ تشریعیہ کو بھی اس سے بڑھ کر یعنی تشریعیہ کو بڑی حد تک خالص غیر سرکاری بنا دیا گیا۔

ہمارا موضوعِ سخن آج اسلامی قانون کی ایک ابتدائی خانگی تدوین ہے جو دوسری صدی کے تقریباً آغاز سے وسط تک جاری رہی یعنی امام ابوحنیفہ کی کوشش جو ۸۰ھ میں پیدا اور ۱۵۰ھ میں فوت ہوئے۔

جیسا کہ معلوم ہوا، تدوینِ فقہ کا یہ عظیم الشان علمی کام کوفے میں انجام پایا۔ کوفے کو حضرت عمرؓ اسلام کی پشت پناہ وغیرہ بہت زیادہ تعریف آمیز الفاظ سے

تک ابوحنیفہ کی وفات ہو چکی اور ابوحنیفہ کے مدونہ قانون کو سیاسی وجوہ سے سرکاری قانون بنانا مناسب نہ معلوم ہوا۔ بہرحال منصور کی خواہش تھی کہ جملہ قاضیوں کو موطا امام مالک کے مکمل ہونے پر اس کا پابند کر دے۔ قدرتاً جب ابویوسف کو ہارون رشید کا قاضی القضاۃ بنا دیا تو چاہیے "مذہب السلطان" ہونے کے باعث ہی سہی (جیسا کہ یاقوت جلد (۶) ص (۱۲) میں اس کا عرف بتایا گیا ہے) بہرحال شرعی حد تک اسلام میں حنفی فقہ سرکاری قانون بن گئی

یاد کرتے تھے اور یہ سب بے وجہ نہ تھا۔

کوفے کی آبادی قدیم شہر حیرہ کے قریب بسائی گئی۔ سدِّ مارب کے ٹوٹنے کے سلسلے میں جب بہت سے یمنی قبیلے شمالی عرب میں ترکِ وطن کرکے آ بسے تو حیرہ بھی لخمی قبائل کا مرکز بنا اور خاندانِ مناذرہ نے یہاں جو عرب حکومت قائم کی وہ ایرانی سرپرستی میں ایک خودمختار مملکت تھی جس کا پائے تخت علم و فن کے چرچوں سے صدیوں تک گونجتا رہا اور وہ ایران و عرب کا علم اور اخلاق دونوں حیثیت سے سنگم بنا رہا۔ منذروں کا خاندان آغازِ اسلام تک بھی برسرِاقتدار رہا لیکن پھر اس علاقے کا الحاق ایران سے ہو کر حیرہ کی حیثیت ایک صوبہ وار شہر کی ہوگئی۔ اتنے میں فتوحاتِ اسلام کے اولین سیلاب میں حضرت ابوبکر صدیق کے زمانے میں سپہ سالار خالد بن الولیدؓ نے اس کی ایرانیوں سے گلوخلاصی کرائی۔

حضرت عمر نے جب مملکت اسلامیہ میں جا بجا چھاؤنیاں تعمیر کرائیں تو حیرہ کے بالکل قریب ایک خالص عربی شہر بسایا جس کا نام کوفہ رکھا گیا۔ شہر کا نقشہ اور دیگر ابتدائی حالات کی تفصیل پروفیسر ماسینیون نے ایک مستقل مقالے میں دی ہے (تاریخ طبری ۱۷ھ میں بھی یہ تذکرہ پندرہ بیس صفحوں میں ہے)۔ یہاں ہمیں صرف یہ معلوم کرنا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ اس چھاؤنی میں حضرت عمر نے کوئی بارہ ہزار یمنیوں کو اور کئی ہزار دیگر قبائل کو بسایا۔ ان میں ایک ہزار پچاس صحابی تھے جن میں چوبیس بدری بھی تھے (سیرۃ النعمان شبلی صفحہ ۳۲ بحوالہ بلاذری و معجم البلدان یاقوت)

حیرہ میں پہلے بھی یمنی ہی تھے اور اب کوفے میں تازہ ہزاروں یمنی آ بسے تھے۔ یمن وہ مقام ہے جس کا تمدن عرب میں بڑا قدیم ہے۔ سبا اور بلقیس کے

متمدن زمانے کے قصے قرآن نے بھی ذکر کئے ہیں۔ ان کے ملک میں جتنے کتبے دستیاب ہوئے ہیں، عرب میں کہیں اور نہیں۔ اس یمن پر عرصے تک یہودیوں کی حکومت اور توریت کی کارفرمائی رہی۔ اس کے بعد حبش کے عیسائی آئے اور انہی کے پادری گرے جنتیوس نے اسکندریہ کے بطریک کے حکم سے یہاں عیسائی قوانین نافذ کئے جن کا مجموعہ مخطوطے کی صورت میں دنیا میں اب تک محفوظ ہے۔ عیسائی حبشیوں کا دور ایرانی حملے کے ذریعے سے ختم ہوا اور اس کے بعد ایرانیوں نے اسلام کے لئے جگہ خالی کی۔ اس طرح معلوم ہو سکتا ہے کہ یمن تہذیب ثقافت کے نقطۂ نظر سے کتنے کثیر دریاؤں کا سنگم بنا اور کتنے دلچسپ روایات وہاں کے تمدن میں سرایت کر گئے۔

انہیں یمنیوں سے کوفہ آباد ہوا لیکن یہی نہیں۔

صحابۂ کرام میں حضرت ابوبکر صدیق کی شخصیت محتاجِ تعارف نہیں۔ جہاں تک قانون کا تعلق ہے، رسولِ خدا نے اپنی زندگی ہی میں ان کو مدینہ منورہ میں مفتی مقرر فرمایا تھا کہ جس کسی کو کسی مسئلے کے متعلق قانونِ اسلام دریافت کرنا ہو، عام طور سے انہیں سے رجوع کرے اور یہ وہ واحد شخص ہیں جو خود رسول اللہ کی موجودگی میں فتویٰ دیتے تھے[2] حضرت عمر، حضرت ابوبکر سے عمر میں دس یا پندرہ سال چھوٹے تھے ایک طرح حضرت ابوبکر کے شاگرد کہے جا سکتے ہیں۔ ان دونوں

---

[1] دیورژے (Desverger) کی فرانسیسی کتاب "عرب" (Arabie) ص (۱۱) حاشیہ۔ ان یہودیوں کو اس کا پابند کیا گیا کہ اپنی لڑکیاں کسی یہودی کو بیاہ نہ دیں بلکہ صرف عیسائی کو دیں۔ ایضاً بحوالہ فرانسیسی تاریخ Hist. de Bas-Empire مؤلفہ Saint-Martin. کتاب ۵۲

[2] کتاب التراتیب الاداریہ المسمیٰ نظام الحکومۃ النبویہ للکتانی جلد ۱ ص ۲

میں اتنی گہری دوستی تھی کہ اکثر یکجا ساتھ رہتے تھے کوئی کام کرنا ہوتا تو مل کر کرتے تھے[1] عہد رسالت کے بعد خلافتِ صدیقی میں دونوں کا اشتراکِ عمل اور باہمی مشورہ اور بھی زیادہ ہو گیا شاید اسی ہم مزاجی کو دیکھ کر ہجرت سے بھی پہلے جب مکے میں مواخاۃ اولیٰ قائم کی گئی تو حضرت ابو بکر اور حضرت عمر ہی میں بھائی چارہ قائم کیا گیا تھا[2] اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ علوم صدیقی نے علوم میں فاروقی کے ساتھ امتزاج حاصل کر لیا۔

حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ نے ابتداً انھیں بزرگوں سے تعلیم پائی پھر براہ راست جناب رسالت سے تفقہ کرتے رہے۔ اور پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ تعریفی سند حاصل فرمائی کہ جسے قرآن سیکھنا ہو وہ عبد اللہ بن مسعود سے سیکھے[3] ان کی ذہانت اور قابلیت دیکھ کر حضرت عمر نے اپنی خلافت کے زمانے میں ان کو کوفے میں معلم بنا کر بھیجا[4] اور یہ وہاں کی جامع مسجد میں فقہ کا درس دیتے رہے۔ ان کے شاگردوں میں یمن ہی کے دو فاضل علقمہ اور اسود نخعی (ف ۷۵ھ) نے امتیاز حاصل کیا اور کوفے میں حضرت ابن مسعود کے جانشین بنے۔ علقمہ کے شاگردوں میں ابراہیم نخعی ایک اور یمنی نے مسجد کوفہ میں درسِ فقہ کا سلسلہ جاری رکھا اور جب ابراہیم نخعی کی وفات ہو گئی تو حماد بن ابی سلیمان نے جو غالباً ایرانی تھے کوفے کی درس گاہِ فقہ کو مزید شہرت عطا کی۔ ابو حنیفہ انہیں حماد کے شاگرد اور جانشین ہیں۔

صرف اتنا ہی نہیں۔ حضرت علیؓ بھی جو انا مدینۃ العلم وعلی بابھا کے خطاب سے

---

[1] مغازی الواقدی (مخطوطہ برٹش میوزیم) ورق (۱۰۳) سیرۃ شامیہ غزوہ خندق

[2] کتاب المحبر مولفہ ابن حبیب باب المواخاۃ (مخطوطہ برٹش میوزیم)

[3] الاستیعاب لابن عبد البر ۳۶۵/۱

[4] ایضاً

بارگاہ نبوی سے سرفراز ہوئے تھے[1] وہ بھی آخری عمر میں کوفہ چلے آئے اور اس طرح حضرت ابن مسعودؓ اور حضرت علیؓ دونوں کے علوم کوفے میں جمع ہو گئے۔

مزید برآں یہ کہ مدینۂ منورہ میں توسیع فقہ کے لیے شوریٰ اور اجماع کا ادارہ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے خاصا منظم کر دیا تھا اس دور کے شیخ بادہ تابعین میں سے "فقہاء سبعہ" نے جلد ہی بڑا امتیاز پیدا کر لیا اور ان سات ماہرین کی کمیٹی نے ایک طرح سے قانون سازی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی سخاوی نے[2] وضاحت سے بیان کیا ہے کہ خود قاضی بھی مدینۂ منورہ میں اس مجلس ہفت گانہ سے مشورہ لیتے اور اس کے فتوے کے پابند تھے۔ ان لوگوں کے نام قابل ذکر ہیں۔

(۱) ماہر قرآن وحساب ومیراث حضرت زید بن ثابت کے بیٹے خارجہ (جو طلحہ بن عبداللہ بن عوف کے اشتراک عمل سے تقسیم وراثت کے مقدمات فیصلہ کرتے اور معاہدات کی دستاویزیں لکھتے)

(۲) حضرت ابوبکرؓ کے پوتے قاسم

(۳) حضرت زبیرؓ کے بیٹے عروہ

(۴) بی بی میمونہ یا بی بی ام سلمہ کے مولا سلیمان بن یسار

(۵) عبیداللہ بن عبداللہ بن عتبہ بن مسعود

(۶) سعید بن المسیب۔

---

[1] یہ حدیث زبان زد عام تو ہے لیکن صحاح میں سے صرف ترمذی میں "انا دار الحکمۃ وعلی بابہا" کے الفاظ میں وارد ہے اور ترمذی نے اسے "حدیث منکر" قرار دیا ہے۔

[2] فتح المغیث للسخاوی ص ۳۹۹ تا ۴۰۰۔

(۱) عبدالرحمن بن عوف کے بیٹے ابو سلمہ یا حضرت عمر کے پوتے سالم یا ابو بکر بن عبدالرحمن بن الحارث بن ہشام القرشی۔ اس ساتویں رکن کے تعین میں اختلاف ہے اور تین نام لئے جاتے ہیں جو تینوں مشہور فقیہ تھے ممکن مذکورہ بالا چھے میں سے بعض کے انتقال پر دو نئے ارکان اس کمیٹی میں شریک کر لئے گئے ہوں۔

امام ابو حنیفہ نے اپنے زمانے کی دنیائے اسلام کے اکثر اہم مرکزوں میں تعلیمی سفر اختیار کیا اور خاص کر مکہ اور مدینہ کئی دفعہ گئے اور مجلسِ ہفت گانہ فقہائے سبعہ کے جو ارکان زندہ تھے ان سے خوب فیض حاصل کیا تھا۔ اسی طرح حضرت علی کے خاندانی سلسلے کے ممتاز ارکان امام محمد باقر اور امام جعفر صادق اور امام زید بن علی زین العابدین سے بھی سالہا سال استفادہ کیا اور آخر میں کوفے ہی میں متوطن ہو کر وہیں فقہ کا درس دیتے رہے۔

ان حالات میں کوئی حیرت نہ ہو اگر سفیان بن عُیینہ نے اپنے زمانے کے حالات کو دیکھ کر یہ کہا ہو کہ "اگر کوئی غزوات (تاریخ اسلام) کی تعلیم پانی چاہتا ہے تو اس کا مرکز مدینۂ منورہ ہے اور کوئی مناسکِ حج کی مہارت پیدا کرنی چاہتا ہے تو مکہ اور اگر فقہ چاہتا ہے تو کوفہ[1]

رسولِ عربی نے اپنی دہ سالہ مدنی زندگی میں جس سیاست کی بنیاد ڈالی تھی اور خاص کر آخری سالوں میں ایران و روم کے لئے جو کارروائی شروع کی تھی اس کو آپ کے جانشینوں نے جاری رکھا اور جب عراق و شام و مصر بھی شہر بند

---

[1] مناقب ابی حنیفہ للصیمری مخطوطۂ استنابول (فوٹو در احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد) ورق ۶۱ ب
نیز معجم البلدان یاقوت ذکرِ کوفہ۔

سے نظامِ مرکزی میں منسلک ہو گئے تو ناگزیر بہت سے صحابہ ان مقبوضہ علاقوں میں جا متوطن ہو گئے۔ اِس وقت دنیا میں مسلمانوں کے جو فقہی مذہب رائج ہیں وہ زیادہ تر تین ہی صحابہ کے مکاتب کی روایات کے حامل ہیں یعنی حضرت ابن مسعودؓ، حضرت ابن عمرؓ اور حضرت علیؓ۔

حضرت ابن مسعودؓ جیسا کہ بیان ہوا کوفہ جا بسے تھے جو نو آباد اور خالص عربی شہر تھا اگرچہ عراق میں واقع اور ایرانی تمدن کے اثرات سے گھرا ہوا تھا اور ان کے تعلیمی سلسلے کی براہِ راست پیداوار علقمہ تھے پھر ابراہیم نخعی پھر حماد اور پھر ابو حنیفہؒ ہیں۔

حضرت ابن عمر زیادہ تر حجاز میں رہتے تھے۔ ان کے شاگردوں میں ان کے مولا نافع نے بڑا امتیاز حاصل کیا۔ امام مالک انہیں کے شاگرد تھے اور مدینہ منورہ میں رہتے تھے۔ امام مالک کے شاگرد امام شافعی اور امام شافعی کے شاگرد امام احمد حنبل ہیں۔

حضرت علی پیغمبر اسلام کے چچا زاد بھائی، پروردہ اور داماد تھے زیادہ تر مدینہ میں رہے۔ آخری عمر میں سیاسی ضرورتوں سے کوفہ جا رہے تھے۔ ان کی تعلیم کا ایک خاندانی سلسلہ بھی چلا اور جملہ شیعہ مذاہب اسی کی شاخیں ہیں۔

جنابِ رسالت مآب (ف سنہ ۱۱ھ)

ابن مسعود الہذلی (ف سنہ ۳۲ھ)	ابن عمر (ف سنہ ۷۳ھ)	علی (ف سنہ ۴۰ھ)
علقمہ نخعی (ف سنہ ۶۲ھ)	نافع (ف سنہ ۱۱۷ھ)	حسین (ف سنہ ۶۱ھ)
ابراہیم نخعی (ف سنہ ۹۵ھ)	مالک (ف سنہ ۱۷۹ھ)	علی زین العابدین (ف سنہ ۹۴ھ)
حماد مولی اشعری (ف سنہ ۱۲۰ھ)	شافعی (ف سنہ ۲۰۴ھ)	زید (ف سنہ ۱۲۲ھ) محمد باقر (ف سنہ ۱۱۴ھ)
ابو حنیفہ (ف سنہ ۱۵۰ھ)	احمد حنبل (ف سنہ ۲۴۱ھ)	جعفر صادق (ف سنہ ۱۴۸ھ)

یہ نہ خیال کیا جائے کہ یہ مختلف مکاتب ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہے اور بالکل علاحدہ ترقی کرتے رہے بلکہ اس زمانے کا رواج تھا کہ ہر بڑا عالم بیسیوں اساتذہ کے درس میں شریک رہا اور ان کی تربیت سے فیض یاب ہوا۔ مثال کے طور بعض عقیدت مند سوانح نگاروں نے امام ابوحنیفہ کے شیوخ کی تعداد ہزاروں تک پہنچادی ہے بہر حال یہ امر قابل ذکر ہے امام ابوحنیفہ کے نہایت گہرے وہ شانہ تعلقات نہ صرف زیدیہ مذہب کے بانی امام زید بن علی زین العابدین سے تھے[1] بلکہ امامیہ مذہب کے بانی جعفر صادق اور ان کے والد محمد باقر کے بھی کہتے ہیں کہ وہ بہت دن تک شاگرد رہے امام مالک سے بھی ان کی ملاقاتیں اور افادے اور استفادے کے لئے مباحث رہتے تھے۔ امام ابوحنیفہ کے شاگرد رشید اور حنفی مذہب کے مشہور امام محمد شیبانی نے بھی امام مالک سے عرصے تک تعلیم پائی تھی۔ یہی حال امام شافعی کا تھا۔ یہ نہ صرف امام مالک کے شاگرد رشید تھے بلکہ امام ابوحنیفہ کے دو بڑے شاگردوں محمد شیبانی اور وکیع سے سالہا سال درس لیا تھا اور محمد شیبانی کی اونٹھ بھر کتابیں (حمل بختی کتباً) انہوں نے نقل کی تھیں[2]۔ غرض جب تک یہ مکاتب تعصبات کا شکار نہ ہوگئے باہم افادہ اور استفادہ جاری رہا اور فراخدلی اور آزاد خیالی کا ملاپ ان کا مسلک تھا۔ لیکن بعد میں ایسے زمانے آگئے کہ شیعوں اور سنیوں ہی نہیں شافعیوں اور حنبلیوں میں تک آپس میں خونریز جھگڑے ہونے لگے اب اس پس منظر کے ساتھ دیکھو تو حنفی شافعی ہی نہیں سنی شیعہ فقہ بھی مخصوص فرقہ وار فقہ نہیں بلکہ وہ مسلمانوں کی مشترکہ فقہ ہے اور خاص کر

---

[1] مناقب موفق ۱/۲۶۰ مناقب کردری ۱/۲۴۴ [2] صیمری ورقہ ۱۲۰/ب ذہبی کی مناقب محمد شیبانی ورق ۷۸

ابتدائی صدیوں میں فرقہ دار اساتذہ اپنے فرقہ تک محدود نہیں رہتے تھے۔ خود جس چیز کو حنفی فقہ کہتے ہیں اس میں ابو حنیفہ کے اقوال پر مشکل سے پندرہ فیصد امور میں عمل ہوتا ہوگا اور جس طرح سے شافعی و مالکی فقہ حنفی فقہا سے متاثر ہوتی رہی ہے حنفی فقہ کی بھی جزئیات میں ترمیم غیر حنفی اثرات سے محسوس و غیر محسوس دونوں طریقوں سے ہر زمانے میں ہوتی رہی اسی لئے ہم نے اس مقالے کا عنوان ابو حنیفہ کی تدوین فقہ حنفی نہیں بلکہ فقہ اسلامی رکھا ہے۔

قرآن کو خود جناب رسالت نے مدون کرایا۔ آثار نبوی یا حدیث کو لکھنے کی بہت سی کوشش مختلف صحابہ نے جناب رسالت کی زندگی میں بھی کیں اور آپ کے بعد بھی اور جن صحابہ نے لکھنے کو اہمیت نہ دی وہ بھی اپنے معلومات زبانی طور سے نو عمر نسلوں میں منتقل کرتے رہے! اس میں تخصیص بھی نظر آتا ہے۔ چنانچہ بعض صحابہ کے متعلق مروی ہے کہ وہ ہفتے میں ایک دن تفسیر پر ایک دن غزوات نبویہ پر اپنے طلبہ کو لکچر دیتے تو باقی دنوں میں مختلف دیگر آثار نبویہ یا علوم اسلامیہ پر جہاں تک فقہ کے موجودہ مفہوم کا تعلق ہے، اور جس میں عبادات، معاملات اور حدود و تعزیرات یعنی فوجداری و دیوانی شامل ہوتی ہیں، عہد نبوی ہی سے اس کے لکھنے کی کوشش شروع ہوچکی تھی فتح مکہ کے وقت جناب رسالت نے جو احکام و اصول سے لبریز خطبہ دیا تھا وہ خود جناب رسالت کے حکم سے لکھ کر ابو شاہ نامی ایک صحابی کو دیا گیا تھا کہ اپنے ملک میں اس کو لے جاکر دستور العمل بنائیں (بخاری) عمرو بن حزم کو یمن کا گورنر بناتے وقت جناب رسالت نے جو طویل تحریری ہدایت نامہ دیا اسے بھی تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ زکات کے سرکاری محاصل جو غلے، جانوروں اور نقد رقم وغیرہ پر وصول کئے جاتے تھے، ان کا نصاب بھی تحریر کرکے محصلین

زکات کو دیا جاتا تھا۔

حضرت ابن عباس (فوت ۶۸ھ) کے پاس کسی شخص نے ایک مرتبہ ایک کتاب پیش کی تھی جس میں حضرت علی کے فتوے یکجا کیے گئے تھے۔ حکام عدالت کے فیصلوں کی نقلیں بھی محفوظ رکھی جاتی ہونگی جس کا امام ابو یوسف وغیرہ کے زمانے سے پتہ چلتا ہے۔ جو صحابہ اپنے طلبہ کو فقہ کی تعلیم دیتے تھے اس کی یادداشتیں بھی لی جاتی رہی ہونگی۔ امام زید بن علی (ف ۱۲۲ھ) کی طرف فقہ میں ایک کتاب المجموع منسوب ہے جو اب چھپ کر دستیاب بھی ہونے لگی ہے اگرچہ ابھی تک اس بحث کا خاتمہ نہیں ہوا کہ یہ کتاب امام زید کی لکھی یا املا کرائی ہوئی ہے یا ان کے لکچروں کو ان کے کسی شاگرد نے بعد میں خود مرتب کیا ہے؟ اگر وہ امام زید ہی کی ہے تو پھر یہ امر دلچسپ ہوگا کہ اس تدوین کا خیال انھیں کس طرح پیدا ہوا؟ اس کی ترتیب ابواب میں انہیں کسی سے مدد ملی؟ اور ان کا طریقہ کار کیا تھا؟ اور آیا وہ انفرادی کوشش تھی یا اشتراک و تعاون کا نتیجہ؟

احادیث نبوی کو فقہی ابواب پر مرتب کرنے کی کوشش امام مالک (ف ۱۷۹ھ) کی موطا سے بھی قبل امام ابن الماجشون (ف ۱۶۴ھ)[1] نے کی لیکن ہوا ہے

---

[1] گولت سیہر کو (محمدانشٹے اشٹودین حصہ ۲ صفحہ ۲۲۲) دھوکہ ہوا ہے اور العامری محمد بن عبدالرحمن مشہور بہ ابن ابی ذئب کو سب سے قدیم موطا نویس قرار دیا حتی کہ ان کی وفات تک کسی سہو سے ۱۲۰ھ لکھدی۔ ان کی وفات اصل میں ۱۵۹ھ میں ہوئی یہ غلطی تحقیق مزید نہ کرنے سے گولت سیہر کے حوالے سے بروکلمان تک (جرمن تاریخ ادبیات عربی (حصہ ۱ صفحہ ۶۵ تا ۶۶) اصل مع ضمیمہ جدید) دہرادی ہے ان دونوں نے حوالہ زرقانی کا دیا ہے لیکن زرقانی نے ابن ابی ذئب کی جگہ ابن الماجشون کو تقدم عطا کیا ہے

زرقانی کی شرح موطا کے دیباچے میں امام کے حوالے سے اس کتاب کوئی پتہ نہیں چلتا۔ امام مالک کی تالیف اسی کی اصلاح اور اس کے جواب میں تھی۔ یہ خیال کیا جاتا رہا ہے کہ اولاً خالص حدیث کے مجموعے تیار ہوئے پھر فقہی احکام کی حدیثیں الگ مرتب ہونے کے بعد آخر خالص فقہی کتابیں تیار ہوئیں لیکن میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ خالص حدیث کے بعد خالص فقہ کی کتابیں لکھی گئیں، اور ردعمل کے طور پہ قانونی احادیث کے مجموعے تیار ہوئے امام زید بن علی، امام ابوحنیفہ اور ابن الماجشون (ف ۱۶۴ھ) جنہوں نے صرف روایات مدینہ جمع کر کے ایک کتاب شائع کی اور دیگر اہل الرائے نے ایک مکتب خیال قائم کیا جس کے پیروؤں نے بعد میں غلو پیدا کیا تو بطور ردعمل اہل حدیث نے سنت کی پیروی پر زور دینے کے لئے فقہی احکام کی حدیثیں الگ مرتب کیں۔

امام مالک (ف ۱۷۹ھ) وغیرہ چند ہم عصروں کی موطاؤں کو اسی تحریک کا آغاز سمجھنا چاہیے اور صحیح بخاری کو اس کی انتہا۔

جب مملکت کے استحکام اور امن و امان کے ساتھ قانونی احکام کی روز افزوں وسعت و کثرت ہونے لگی تو ان کے مجموعوں کی ضرورت حکومت نے بھی محسوس کرنی شروع کی اور خانگی علماء نے بھی مذکورہ بالا مختصر پس منظر سے فوراً معلوم ہو سکتا ہے کہ امام ابوحنیفہ (ف ۱۵۰ھ) کی کوشش فقہ کو مدون کرنے کے متعلق اپنی نوعیت کی اولین نہ تھیں لیکن ان کے کام کی وسعت تنوع

(بقیہ)
اور امام مالک کا پیشرو قرار دیا ہے ابن ابی ذئب کی طرف ایک موطا منسوب کی ہے اور کوئی اور امر بیان نہیں کیا ہے چونکہ یہ امام مالک سے زیادہ معمر تھے اس لئے ممکن ہے انہوں نے موطا پہلے تالیف کیا ہو

اور فنی خصوصیات کے باعث ان کی کوششیں اوروں سے زمانے میں متاخر ہونے کے باوجود مہر نقشِ ثانی کی طرح زیادہ دلکش ہیں اور آج انھیں کا مختصر ذکر مطلوب ہے۔

ابوحنیفہ نعمان بن ثابت بن زوطی (یا زوطرہ) کی ولادت ۸۰ھ میں ہوئی ان کے متعلق بڑا اختلاف پایا جاتا ہے کہ یہ نسلاً کون تھے؟ کوئی عرب بتاتا ہے تو کوئی ایرانی، کوئی افغانی کابلی بتاتا ہے تو کوئی باپ کو ایرانی اور ماں کو سندھی تاریخ بغداد (۲۹۷/۱۳ - ۳۲۵) میں خطیب نے علاوہ کابل، بابل انبار، ترمذ اور نسا کے ایک روایت ان کے نبطی ہونے[۵] کی بھی درج کی ہے۔ نبطی عموماً یہودی ہوتے تھے اور بعض وقت کسان پیشہ بھی بلالحاظ قومیت ہمیں اس بحث سے زیادہ دلچسپی نہیں ہونی چاہیئے کیونکہ اسلام نے شعوب و قبائل کی نسبت کو باہم تعارف اور پہچانت کی حد تک تو جائز رکھا ہے ورنہ اس اجازت کے ساتھ ہی اس نے کہہ دیا ہے کہ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم اگر اس بحث کی تکمیل اور تحقیق سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کیجائے کہ قانون اسلام کی تدوین یا ارتقا پر امام ابوحنیفہ کے ذریعے سے کونسے بیرونی اثرات پڑے تو وہ بھی لاحاصل ہوگی کیونکہ جاننے

---

[۴] ذہبی کی مناقب ابی حنیفہ میں (جس کا نایاب مخطوطہ کتب خانہ سعیدیہ حیدرآباد میں ہے) ان کا نسب نعمان بن ثابت بن نعمان بن مرزبان ہے بعض روایتوں میں زوطی بن ماہ کا جو نام ملتا ہے وہ شبلی (سیرۃ النعمان) کی رائے میں بعد میں نعمان بن مرزبان ہوگیا۔ زوطی کے لفظ کا ہندوستانی "جاٹ" سے بھی ممکن ہے کچھ تعلق ہو۔

[۵] ابن سیرین کو ابوحنیفہ پر چوٹ کرنی ہوتو "نبطی زادہ" ہی کہا کرتے تھے (صیمری ورق ۵۵/ب)

ان کے دادا ایک آزاد کردہ غلام نومسلم ہی کیوں نہ رہے ہوں خود ان کی آنکھ مسلمان گھرانے میں کھلی تھی، ماحول خالص اسلامی ملا اور زندگی زیادہ تر کوفے کے یا بغداد کے اسلامی شہروں میں گذری تو وہ فارسی ضرور جانتے تھے (مناقب الامام الاعظم موفقہ الموفق ج ۲ ص ۵۵ تا ۵۵) اور ان کے اساتذہ میں عطا ابن ابی رباح نوبہ کے حبشی تھے عکرمہ مولا ابن عباس بربر کے تھے، مکحول شامی یا مصری یا کابلی تھے اور عربوں کے علاوہ مختلف نسلوں کے عجمی مسلمانوں سے بھی تعلیم پائی تھی۔ تجارت غالباً ان کا آبائی پیشہ تھا۔ بہرحال ہم ان کو ریشم کے کپڑوں کا کاروبار عمر بھر کرتا پاتے ہیں اور زمانہ طالب علمی میں بھی ان کو "خزاز" (مالدار) کہا جاتا دیکھتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ شروع میں انہیں تعلیم کا نہ تو شوق تھا اور نہ موقع ملا تھا۔ اور وہ اپنی ذہانت و توانائی بازار ہی میں صرف کرتے تھے۔

شعبی ایک مشہور محدث گذرے ہیں ان کی مردم شناس آنکھ نے ہونہار ابوحنیفہ کا جوہر تاڑ لیا اور ایک دن پوچھ لیا کہ صاحبزادے تم کسی سے تعلیم پاتے ہو؟ اور جب کاروبار کا نام سنا تو فرمایا کہ تو غفلت نہ کرو اور علم حاصل کرنے اور علماء کے ساتھ نشست پر نظر رکھو کیونکہ میں تم میں ایک بیداری اور حرکت پاتا ہوں (موفق ۵۹/۱) حساس دل پر بے غرضانہ خلوص کا فوراً اثر ہوتا ہے چنانچہ انہوں نے اب اعلیٰ تعلیم پر توجہ کی اور یکے بعد دیگرے بہت سے اساتذہ کے حلقہ ہائے درس میں شریک ہو کر اپنی پسند کا معلم انتخاب کرنے لگے (موفق ۶۳/۱)

بعض بیانوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انہیں شروع میں علم کلام سے دلچسپی ہوئی جو اس زمانے میں نیا نیا رواج پذیر ہوا تھا اور آپ نے کافی درک بھی پیدا کر لیا۔ لیکن ایک دن کسی بڑھیا نے ان سے مذ زمرۃ کا مسئلہ کا کوئی معمولی

مسئلہ پوچھا تو اس میں یہ کورے نکلے (صیمری ورق ۱۸) اس سے ان کے دل کو بڑی چوٹ لگی کہ وہ علم ہی کس کام کا کہ غیر محسوس امور کے متعلق تو زمین آسمان کے قلابے ملائیں اور روزمرہ کی ضرورتوں کے احکام سے نابلد رہیں۔

ایک بعد کے زمانے میں ان کے ایک شاگرد ہیثم بن عدی الطائی نے ان سے پوچھا تھا کہ علوم تو بہت سے ہیں آپ نے فقہ ہی کیوں انتخاب کیا تو انہوں نے کہا تھا: "میں بتاؤں توفیق تو خدا کی طرف سے ہوئی اور تعریف کا اہل و مستحق وہی ہے، بہرحال جب میں نے علم حاصل کرنے کا ارادہ کیا تو سب ہی علم اپنے سامنے رکھے اور سب کو تھوڑا تھوڑا پڑھا اور پھر ان کے انجام اور نفع پر غور کیا چنانچہ میں نے علم کلام کو لینا چاہا تو نظر آیا کہ اس کا انجام برا ہے اور منفعت تھوڑی اور اگر کوئی شخص اس میں کمال بھی پیدا کرلے اور لوگوں کو اس کی ضرورت پڑے تو بھی وہ علانیہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ورنہ اس پر ہر قسم کے الزام لگائے جاتے ہیں اور اسے برا کہا جانے لگتا ہے پھر میں نے ادب اور نحو پر غور کیا اس کا انجام صرف یہ نظر آیا کہ کسی بچے کا معلم بن سکوں پھر میں نے شاعری پر غور کیا تو دیکھا کہ اس میں ہجو و ہجا اور جھوٹ اور دین کی مخالفت کے سوا انجام کچھ نہیں۔ پھر قرارت پر غور کیا تو اس میں کمال کا انجام یہ نظر آیا کہ کچھ نوجوان میرے پاس پڑھنے آئینگے اور قرآن اور اس کے معنوں پر کچھ کہنا بڑی ٹیڑھی چیز ہے۔ پھر میں نے کہا کہ حدیث پڑھوں تو دیکھا بہت سی حدیثیں جمع کرکے لوگوں کے لئے اپنی احتیاج پیدا کرنے میں بڑی عمر لگے گی اور جب یہ چیز حاصل بھی ہو جائے تو شاید صرف نو عمر ہی میرے پاس آئیں اور ممکن ہے کہ مجھ پر جھوٹ یا بھول کا الزام لگائیں اور قیامت تک وہ میری بدنامی کا باعث ہو جائے۔ پھر میں نے فقہ پر غور کیا اور جتنا زیادہ

غور کیا اتنا ہی اس کی عظمت و جلالت ذہن نشین ہوتی گئی اور اس میں کوئی عیب نظر نہ آیا اور میں نے دیکھا کہ ایک تو اس طرح ہمیشہ علماء، فقہاء، مشائخ اور اہل نظر کی ہمنشینی حاصل ہوگی اور ان کے اخلاق سے متصف ہونے کا موقع ملے گا اور دوسرے یہ بھی نظر آیا کہ اس کے جاننے کے بغیر نہ تو مذہبی فرائض کی ادائی ٹھیک ہو سکتی ہے نہ دینی امور انجام پا سکتے ہیں اور نہ عبادت کی جا سکتی ہے۔ یوں بھی اگر گھر میں یا رشتہ داروں میں یا محلے میں کوئی مسئلہ پیش آئے تو لوگ مجھ سے پوچھیں گے اور اگر میں جواب نہ دے سکوں تو کہیں گے کہ پوچھ کر بتلاؤ اور اگر میں کسی سے پوچھوں تو وہ معاوضہ کی توقع کرے گا غرض اگر کوئی فقہ سے دنیا حاصل کرنا چاہے تو اعلیٰ ترین مراتب پر پہنچنے کے امکانات ہیں اور اگر کوئی عابد اور عزلت گزیں بننا چاہے تو پھر کوئی یہ اعتراض نہ کر سکے گا کہ بے جانے بوجھے عبادت میں لگ گیا ہے بلکہ یہی کہا جائے گا کہ علم حاصل کر کے اس کے مطابق عمل کیا ہے۔" (موفق، ۱/ ۵۸ تا ۵۹)

تاریخ بغداد (۱۳/ ۳۳۱ تا ۳۳۲) میں خطیب نے یہی روایت یوں بیان کی ہے کہ انہوں نے بعض احباب سے مشورہ کیا اور مختلف علوم کے نتائج اور خامیاں بھی انہیں نے ابو حنیفہ کو بتائیں۔

بہر حال جب امام ابو حنیفہ نے فقہ پر توجہ کی تو شہر کوفہ کے مختلف اساتذہ کے حلقہ ہائے درس میں حاضر ہوتے گئے مگر سوائے حماد بن ابی سلیمان کے کوئی نظر میں نہ جچا چنانچہ ان کی وفات تک برابر ان کے سامنے زانوئے ادب تہ کرتے رہے (موفق ۱/ ۵۴)۔

حضرت ابن مسعود نے حضرت عمر کے حکم سے بطور معلم آکر کوفے میں سکونت اختیار کر کے درس و تدریس کا جو اہم سلسلہ شروع کیا تھا اسے علقمہ پھر ابراہیم نخعی اور ان کے بعد حماد جیسے ممتاز فقہاء نے جاری رکھا تھا اور خود امام ابو حنیفہ کے الفاظ میں جو انہوں نے خلیفہ منصور سے کہے تھے: حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت ابن مسعودؓ

اور حضرت ابن عباس کے علوم کا سنگم اس رستے میں ہو گیا تھا (صیمری ورق ۲۰/۱-ب) جس کے باعث اس مکتب نے خاص وقار حاصل کر لیا تھا۔ اب حماد کی وفات پر خوف ہوا کہ کہیں یہ نام مٹ نہ جائے اور یہ سلسلہ ٹوٹ نہ جائے پہلے حماد کے قابل بیٹے اسماعیل کو مسند نشین کرنے کی خواہش ہوئی لیکن انھیں فقہ سے زیادہ شاعری اور تاریخ سے دلچسپی تھی آخر حماد کے شاگردوں نے باہم مشورہ کیا اور سب کی نظر اپنے کمسن شریک درس ابو حنیفہ کے سوا کسی پر نہ جمی اور سبھوں نے انھیں کو مجبور کرنا شروع کیا۔ انھوں نے کہا بھائیو! مجھے عذر نہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم میں سے کم سے کم دس پورے سال بھر میرے درس میں موجود رہا کرو۔ انھوں نے یہ ایثار منظور کیا کہ ہم جماعت کے شاگرد بنیں اور اس طرح اس حلقۂ درس کو عوام میں ایک وقار حاصل ہو گیا اور لوگ کھنچے چلے آنے لگے۔ ابو حنیفہ نے اپنے اخلاق اور اپنی دولت سے بھی اچھا کام لیا۔ شاگردوں وغیرہ میں سے غربا کی امداد اور خوش باش لوگوں کو تحفے تحائف دینے کا سلسلہ ہمیشہ جاری رکھا۔ اس طرح رفتہ رفتہ کوفے کے جامع مسجد میں ان کا حلقۂ درس سب سے بڑا حلقہ بن گیا اور ان کی ذہانت کے چرچے پھیل گئے۔ چونکہ وہ خود خوشحال تھے اور علمی انہماک کے سوا دنیاوی جاہ و منصب کی خواہش نہ رکھتے تھے اس لئے سرکاری حلقوں میں بھی ان کی وقعت بڑھتی چلی گئی (موفق ۱/۲۶۹ تا ۲۷۰)

شہرت سے معصروں کو حسد پیدا ہوا کرتا ہے۔ امام ابو حنیفہ کے ہم عصر بھی اس سے مستثنیٰ نہ رہے۔ خاص کر شہر کے قاضی اور کوتوال ان سے بہت جلتے تھے کیونکہ بسا اوقات ان کے فیصلوں پر ابو حنیفہ تنقید کر کے غلطیاں نمایاں کر دیا کرتے تھے۔ چنانچہ ایک واقعہ ہے کہ ایک مرتبہ بغداد کے قاضی نے شہر کی ایک پیشہ ور طوائف کو آمادہ کیا کہ امام حنیفہ کو کسی بہانے اپنے گھر بلائے۔ رات کو وہ مصیبت زدہ

بن گرآئی اور اپنے بستر مرگ پر پڑے ہوئے شوہر کی تلقین کے لئے بلایا۔ درد مند امام گلیوں میں سے گذر کر اس کے گھر پہنچے تو پہلے سے تیار پولیس نے ان کو گرفتار کر کے طوائف کے ساتھ رات بھر حوالات میں رکھا کہ ان کا چالان کر کے عبرتِ خلق اور آئندہ گواہی کے ناقابل قرار دیا جائے۔ ابوحنیفہ رات بھر حسب عادت نوافل اور عبادت میں مصروف رہے۔ اس کو دیکھ کر تھوڑی ہی دیر میں طوائف سخت پشیمان ہو گئی اور پورا واقعہ بیان کر کے معافی چاہی کسی طرح ابوحنیفہ کی بیوی بھی پتہ چلا کر بڑی رات گئے حوالات آئیں تو طوائف بڑی خوشی سے ان سے کپڑے بدل کر وہاں سے رخصت ہو گئی۔ صبح کو ابوحنیفہ مع اپنی بیوی کے عدالت میں پیش ہوئے اور عدالت کو مجبوراً انہیں عزت سے بری کرنا پڑا (موفق ۱/۱۹۱-حمید طوسی (کوتوال) نے۔ اور ایک روایت میں افسر تعارفِ شاہی (حاجب)

ربیع نے ایک دن منصور کے سامنے ابوحنیفہ سے یہ خطرناک سوال کیا کہ وقت بوقت ہم کو خلیفہ قتل وغیرہ سزاؤں کے نفاذ پر مامور کرتا ہے اور ہمیں مقدمے کے حالات کا علم نہیں ہوتا کہ سزا منصفانہ ہے یا ظالمانہ ایسی صورت میں ہم حکم کی تعمیل کریں یا نہیں؟ ابوحنیفہ نے جرح کی کہ "تمہاری رائے میں خلیفہ منصفانہ حکم دیتا ہے یا ظالمانہ؟" اس نے کہا "منصفانہ"۔ ابوحنیفہ نے کہا "تو منصفانہ احکام کی فوراً تعمیل کرو۔ اس میں ثواب ہے" اور اس طرح علمی سوال کو ملمی بنا کر خودداری کی لاج رکھی (صیمری ورق ۵۰/ب۔ مناقب مولفہ ذہبی بر موقع)

مشہور مورخ ابن اسحاق کی بھی امام ابوحنیفہ سے نہیں بنتی تھی۔ ایک دن وہ اور ابوحنیفہ دونوں خلیفہ منصور کے پاس موجود تھے۔ ابن اسحاق نے موقع دیکھ کر کہا، " امیرالمومنین یہ شخص کہتا ہے کہ حضور کے جدامجد حضرت ابن عباس نے اس مسئلے میں غلطی کی تھی جب یہ کہا تھا کہ کوئی شخص قسم کھا کر بعد میں کسی وقت

بھی ان شاء اللہ کہے تو قسم کی پابندی باقی نہیں رہتی اور کہتا ہے کہ ان شاء اللہ قسم
کے ساتھ فوراً کہنا چاہیے"۔ ابو حنیفہ نے جواب دیا "امیر المومنین یہ شخص
کہتا ہے کہ آپ کی فوج پر آپ کی اطاعت واجب نہیں کیونکہ سپاہی بیعت کا حلف لینے
کے بعد گھر میں جا کر ان شاء اللہ کہہ دیتے ہیں"۔ خلیفہ ہنس پڑا اور ابو حنیفہ عزت
کے ساتھ گھر واپس آئے (موفق ۱/۱۴۳ تا ۱۴۴ - کردری ۱/۱۸۴)

امام ابو حنیفہ کو ایک بڑھیا کے سامنے فقہ کے ایک معمولی روزمرہ کے
مسئلے کے متعلق جو خفت برداشت کرنی پڑی تھی معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اثر
ان کے دل پر ہمیشہ رہا۔ چنانچہ فقہ میں درک حاصل کرنے، حماد کا جانشین بننے
اور بہت سے شاگرد فراہم ہو جانے کے بعد انھوں نے اپنی دیرینہ دلی آرزو
پوری کرنے کی کوشش کی اور چاہا کہ مختلف ابواب کے مسائل مرتب کریں۔ چنانچہ
انھوں نے اسلام کی بنیاد یعنی نماز سے آغاز کیا اور اس پر ایک رسالے
میں بہت سے احکام جمع کئے اور اس کا نام کتاب العروس رکھا (موفق ۱/۹۶ تا ۹۷)
اس رسالے کی مقبولیت سے ہمت پا کر انہوں نے چاہا کہ مزید ابواب کے مسائل
مرتب کریں کہ یک بیک ایک ایسا واقعہ پیش آیا جو ہر راسخ العقیدہ مسلمان کو بے چین
کر دینے کیلئے کافی ہے۔ چنانچہ ابو حنیفہ نے خواب میں دیکھا کہ پیغمبر اسلام کی قبر
کھود کر اندر کی ہڈیاں چو طرف پھینک رہے ہیں۔ تعبیر خواب کے فن کے بعض
ماہرین[1] نے بتایا کہ ایسا خواب دیکھنے والا پیغمبر اسلام کے علوم کو زندہ کر کے پھیلائے

۱؎ عام طور پر بصرہ کے امام ابن سیرین کا اس سلسلے میں نام لیا جاتا ہے۔ مگر شبلی نے (سیرۃ النعمان
صفحہ ۵۵ میں) اس پر اعتراض کیا ہے کہ ابن سیرین کی وفات سنہ ۱۱۰ھ میں ہوئی اور امام ابو حنیفہ
کو یہ خواب حماد کی وفات (سنہ ۱۲۰ھ) کے بعد ہوا ہوگا بہرحال کسی نے تعبیر کی ہوگی۔ خواب
(بقیہ)

عام میں پھیلائے گا۔ اس پر ابو حنیفہ بہت خوش ہوئے اور گوشہ گزینی چھوڑ کر دوبارہ فقہ کا درس دینے اور تدوین فقہ کا کام جاری رکھنے پر آمادہ ہوئے (موفق ۱/۹۲تا ۹۸)

اس کا پتہ چلتا ہے کہ ہر انقلاب حکومت کے وقت نئے حکمران ملک کی (قلعیوں کو ہمنوا بنانے کی کوشش کرتے ہیں (تاریخ طبری ۲۱۰۶ کے مطابق) حضرت ابو بکر نے تک سپہ سالار خالد بن الولید کو عراق میں یہی کا حکم دیا تھا۔ ۱۳۲ھ میں بنی امیہ کا خاتمہ ہوا تو کوئی تعجب نہیں کہ عباسیوں نے بھی ایسا ہی کیا ہو۔ بہرحال اس کا پتہ چلتا ہے کہ امام ابو حنیفہ کے زمانے میں ذمیوں یعنی یہودیوں، نصرانیوں، پارسیوں وغیرہ کے تعلقات مسلمانوں سے اچھے تھے اور بعض ذمی غریب مسلمانوں کی مالی مدد وغیرہ کرتے تھے تاکہ رسوخ حاصل کریں اور بعض مسلمان ایسی امداد کے قبول کرنے کو تہلکہ اور تقوے کے خلاف سمجھتے تھے (موفق ۱/۲۹۹)۔

ایسے دوستانہ تعلقات کے زمانے میں یہ ناگزیر نہیں تو ناممکن بھی نہیں ہے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں وغیرہ میں دوستانہ بحثیں بھی ہوا کرتی ہوں اور کیا تعجب ہے کہ مسلمانوں کو طعنہ دیا گیا ہو کہ تمہارا قانون مدوّن ہی نہیں ہے اور ہمارا قانون باقاعدہ مرتب شدہ موجود ہے۔ ممکن ہے ایسے ہی کسی طنز پر امام ابو حنیفہ نے پورا اسلامی قانون مرتب کرنے کی کوشش شروع کی ہو۔ ضرورت بہت دن سے تھی باعث کا پتہ نہیں چلتا۔ بہرحال کیوں قانون اسلامی کو مدون کیا؟ اس کا جواب سوائے قیاس آرائی کے نہیں دیا جا سکتا۔ کیا کام کیا؟ اس سے سب لوگ واقف ہیں۔ کس طرح وہ کام انجام دیا اس پر کچھ مواد یہاں فراہم کیا گیا ہے۔

ابھی ہم نے دیکھا کہ حماد کی وفات پر ابو حنیفہ کوفے میں فقہ کا درس دینے

(تتمہ صفحہ سابق)

بھی آغاز تعلیم فقہ پر نظر آیا ہو سکتا ہے اور ابن سیرین ہی تعبیر کر سکتے ہیں۔

لگے تھے۔ ان کا طریقۂ تعلیم چند ایک منتشر بیانات سے معلوم ہو سکتا ہے۔ اعمش ایک مشہور فقیہ گذرے ہیں ان سے اگر کوئی کچھ مسئلہ دریافت کرتا تو وہ کہتے جاؤ اس حلقے میں پوچھو یعنی ابوحنیفہ کے پاس کیونکہ اگر کوئی مسئلہ پیش آتا ہے وہ اسی باہم بحث کرتے ہیں حتیٰ کہ وہ خوب روشن ہو جاتا ہے۔ (مناقب کردری ۲۔۵)

ابن عیینہ مشہور محدث تھے۔ ایک دن وہ گذرے تو دیکھا کہ ابوحنیفہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مسجد میں ہیں اور خوب غل مچی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا ابوحنیفہ یہ مسجد ہے یہاں آواز نہ اٹھنی چاہئیے۔ ابوحنیفہ نے کہا انہیں چھوڑ دیجئے۔ اس کے بغیر وہ سمجھتے نہیں (کردری ۲۔۸)۔

ایک دن یہ سوال تھا کہ بلوغ کس عمر میں سمجھا جائے۔ اس دن تیس شاگرد موجود تھے۔ ابوحنیفہ نے سب سے پوچھا کہ وہ کب بالغ ہوئے؟ اکثر نے اٹھارواں سال بتایا اور چند نے انیس۔ اس پر انہوں نے مرد کا بلوغ اکثریت کے تجربے پر اٹھارہ سال میں مقرر کیا (موفق ۱۔۹۸)۔

ایک دن کسی نے فقہ کا درس اور قیاس آرائی دیکھی تو فقرہ کس دیا کہ "قیاس سب سے پہلے ابلیس نے کیا تھا۔" (مراد یہ تھی کہ خدا نے جب حضرت آدم کو سجدے کا حکم دیا تو آتشی مخلوق کو خاکی مخلوق سے افضل قیاس کر کے ابلیس نے خدا کا حکم ماننے سے انکار کیا تھا) ابوحنیفہ اس کی طرف متوجہ ہوئے اور کہا بھلے مانس تم نے بے محل بات کہی ہے ابلیس نے خدا کے حکم کو ٹھکرایا تھا اور ہم ایک مسئلے کو دوسرے پر صرف اس لئے قیاس کرتے ہیں اسے قرآن یا سنت یا اجماع امت کے اصول کے تابع کریں اور اسی کی کوشش کرتے ہیں اور خدا کے حکم کی پیروی چاہتے ہیں پھر یہ اور وہ دونوں ایک کیسے ہوئے؟" (موفق ۱۔۹۸)

ایک اور دن کسی نے ان کے اجتہاد کرنے پر اعتراض کیا تو کہا میں قرآن ہی کو لیتا ہوں اگر اس میں حکم ملے۔ اگر اس میں نہ ملے تو رسول کی سنت پر عمل کرتا ہوں اور ثقہ لوگوں کے ذریعے سے جو صحیح حدیث نبوی ملے اس کو لیتا ہوں۔ اگر قرآن میں حکم ملے اور نہ سنت نبوی میں تو آپ کے صحابہ کے اقوال پر نظر ڈالتا ہوں۔ اگر ان میں باہم اختلاف ہو تو خود کسی ایک کو ترجیح دیتا ہوں لیکن اگر صحابہ اور غیر صحابہ میں اختلاف ہو تو صحابہ کے قول کو ہرگز نہیں چھوڑتا۔ ہاں جب رائے ابراہیم اور شعبی اور حسن بصری اور ابن سیرین اور سعید بن المسیّب وغیرہ وغیرہ کی ہو تو جس طرح ان کو اجتہاد کا حق ہے مجھے بھی ہونا چاہیے۔" (موفق ۱/۹)

محمد ابن ابی مطیع کہتے ہیں کہ میرے باپ نے کوئی چار ہزار مشکل سوالات مرتب کئے جو ہر باب سے متعلق تھے یا واقعات پیش آچکے تھے وہ اپنا سوال بند لاکر ابو حنیفہ سے جوابات پوچھا کرتے تھے ابو حنیفہ نے کہا "ابو مطیع کیا ایسے بہت سے سوالات ہیں؟" کہا تقریباً چار ہزار۔ ابو حنیفہ نے کہا "میری مشغولیت کے وقت یہ چیزیں نہ پوچھو دریافت اس وقت کرو جب میں فارغ رہوں چنانچہ وہ ابو حنیفہ کی فراغت کے انتظار میں رہا کرتے تھے اور رفتہ رفتہ تمام سوالات ختم کر دیئے (موفق ۱/۱۴۱ تا ۱۴۲)

ابو حنیفہ کا قول ہم نے ابھی سنا کہ وہ فقہی سوالات کے حل کرنے میں قرآن کو سب سے زیادہ اہمیت دیتے تھے ان کا قرآنی مطالعہ ظاہر ہے کہ بہت وسیع ہونا چاہیے وہ حافظ تو تھے ہی شروع شروع میں روزانہ پورے قرآن کا ختم کر لیا کرتے تھے لیکن بعد میں جب اصول کے استخراج اور مسائل کے استنباط میں مشغول ہو گئے تو بھی تین دن میں ایک ختم ضرور کر لیتے تھے (موفق ۱/۲۴۲)۔

حقیقت میں ان کو قرآن سے عشق معلوم ہوتا ہے چنانچہ لکھا ہے کہ جب

کبھی کسی نہایت دقیق مسئلے پر غور کرنا ہوتا تو وہ تخلیے میں اپنے تین مخصوص شاگردوں کو لیتے جن میں سے ایک خوش الحانی سے کچھ آیات کی تلاوت کرتا پھر ابو حنیفہ ان سے اس مسئلے میں باہم بحث کرتے (موفق ۲/۹۶)۔

ابو بکر مقتصی کا بیان ہے کہ میں ایک مرتبہ تین سال تک ابو حنیفہ کے پڑوس میں رہا میں رات بھر ان کو نماز میں قرآن پڑھتے سنتا اور دن بھر اپنے شاگردوں سے فقہی مسائل کی بحث کے شور وغل میں پاتا۔ میں نہیں جانتا وہ کھاتے کب اور سوتے کب تھے (موفق ب ۱/۲۵۰۔ دیگر شہادت موفق ۱/۲۵۱)۔

کوفے کی مسجد میں وقف کی چار سو دواتیں طلبہ کے لئے ہمیشہ رہتی تھیں (موفق ب ۱/۴۲) اور یقیناً ابو حنیفہ کے سینکڑوں ہی شاگرد ہوئے ہونگے۔ امام سیف الائمہ سائلی کا بیان ہے کہ ابو حنیفہ کے ایک ہزار شاگرد تھے، جن میں چالیس خاص فضیلت وجلالت رکھتے تھے بلکہ اجتہاد کے درجے تک پہنچ چکے تھے۔ ابو حنیفہ ان کو خاص طور سے عزیز رکھتے اور ان کو تقرب حاصل تھا ایک دن انہوں نے ان چالیس شاگردوں سے کہا کہ تم میرے سب سے جلیل القدر ساتھی اور میرے دل کے راز داں اور میرے غمگسار ہو میں فقہ کی اس سواری کو زین اور لگام لگا کر تمہارے سپرد کر چکا ہوں اب تمہیں چاہیئے کہ میری مدد کرو کیونکہ لوگوں نے مجھے دوزخ کا پل بنا دیا ہے کہ سہولت تو دوسروں کو ہوتی ہے اور بوجھ میری پیٹھ پر رہتا ہے (موفق ۲/۳۳)۔

ان چالیس طلبہ میں سے مختلف ایسے علوم وفنون کے بھی ماہر تھے جن سے فقہ میں مدد ملتی مثلاً تفسیر، حدیث وسیرت، بلاغت وبیان، صرف ونحو، لغت وادب، منطق، ریاضی وحساب وغیرہ وغیرہ خود ابو حنیفہ عملی معاشیات اور تجارتی کاروبار کا وسیع تجربہ رکھتے اور علم کلام وغیرہ سے بھی ابتدائے تعلیم میں

خوب واقفیت پیدا کر چکے تھے (مبسوط سرخسی $\frac{1}{۳}$۱۴ موفق ۲۳، ۲۲، ۲۳، $\frac{۲}{۱۳۴}$)۔

ایک حدیث میں ہے کہ "خدا علم کو یک بیک اٹھا نہیں لیتا ہے بلکہ علماء کی موت کے ذریعے سے اس کو چھین لیتا ہے اور جاہل لوگ سردار بن جاتے ہیں جو ناسمجھی سے احکام دیتے ہیں"۔ کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ اس حدیث سے بہت متاثر تھے انہوں نے اپنے زمانے میں دیکھا کہ علماء تو ہیں لیکن علم منتشر ہے اور خوف ہے کہ ناخلف نسلیں آئندہ اسے ضائع نہ کر دیں۔ اسی لئے انہوں نے فقہ کے مسائل کو باب وار مرتب کرنے کا کام شروع کر دیا۔ (موفق $\frac{1}{۳۴}$ $\frac{۲}{۱۳۶}$)

اس مجلس تدوین فقہ میں ہم کو بڑے بڑے نام ملتے ہیں۔ امام ابو یوسف، امام محمد شیبانی اور امام زفر کے نام سے بچہ بچہ واقف ہے۔ عبد اللہ بن مبارک اور فضیل بن عیاض اور داود بن نصیر جیسے عابد و زاہد بھی اس میں شریک تھے وکیع جیسے ماہر تفسیر بھی تھے۔ حسن بن زیاد جیسے فقیہ اور حفص جیسے ماہر حدیث بھی تھے ان کے علاوہ خارجہ بن مصعب سے ابو حنیفہ اکثر مشورہ کرتے (موفق $\frac{1}{۲۲۲}$) اور عافیہ نامی شاگرد کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فقہی غور و خوض میں شریک رہا کرتے تھے اور اگر کسی دن وہ نہ ہوتے تو ابو حنیفہ کہتے کہ بحث کو ابھی مکمل نہ سمجھو چنانچہ عافیہ آکر بحث کے نتیجے سے اتفاق کر لیتے تو پھر اس کو ختم سمجھا جاتا (جواہر عبد القادر $\frac{۳}{۲۰۳}$) انھیں میں یحییٰ بن زکریا حبان، مندل، قاسم بن معن بن عبد الرحمن بن حضرت عبد اللہ بن مسعود وغیرہ کے نام بھی ملتے ہیں (موفق $\frac{1}{۳۴}$)۔

ابو حنیفہ کا طریقہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ایک مسئلہ پیش کرتے اور ہر ایک کے معلومات اس کے حل کے لئے دریافت کرتے اور اپنی رائے بھی پیش کرتے اور مہینہ بھر بلکہ اس سے بھی زیادہ تک مناظرہ جاری رہتا اور جب کسی رائے کے دلائل پوری طرح واضح ہو جاتے تو پھر ابو یوسف اس کو لکھ لیتے

دموفق ۴۲/۱۔ کردری ۲/۱) اور دیگر ائمہ کے برخلاف امام ابوحنیفہ نے انفرادی کوشش اور تنہا استبدادی رائے کی جگہ اپنے مذہب کو شوریٰ پر منحصر کردیا تھا (حوالہ ایضاً)۔ ایک مرتبہ کسی نے ان سے ایک خاص مسئلے کے متعلق پوچھا کہ صحابہ کرام تک اس کے متعلق ایک رائے پر متفق نہیں ہوسکے تھے آپ کیسے قطعی رائے ظاہر کرتے ہیں؟ ابوحنیفہ نے کہا کیا یہ خیال کرتے ہو کہ میں نے یوں ہی رائے قائم کر لی ہے؟ میں نے خاص اس مسئلے پر پورے بیس سال فکر و غور کیا اس کی مماثل چیزیں ڈھونڈیں اور ہر صحابی کے قول کی اصول مسلمہ پر جانچ کی (کردری ۱۵/۱-۱۱۶)۔

ایک دفعہ انہوں نے قیاس کا اصول یوں بیان کیا تھا کہ قیاس ہر ایک چیز میں نہیں چلتا، قیاس صرف ان چیزوں میں چلتا ہے جن کا رائے سے ادراک ہوسکتا ہو قیاس کسی طرح ارکانِ دین کے ثابت کرنے اور اسباب و علل میں نہیں چلتا بلکہ صرف احکام کے ثبوت کے لئے چلتا ہے (کردری ۱۴۲/۱)۔

اس طرح باب بباب تدوین ہوتی گئی اور انہوں نے سب سے پہلے وضو اور طہارت کا باب رکھا کیونکہ ایمان کے بعد اسی کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے (کردری ۵۴/۱)۔

اس باب وار تدوین اور کتاب وار ترتیب میں طہارت کے بعد نماز پھر روزہ پھر حج کے بعد دیگر تمام عبادات کا ذکر کیا۔ عبادات کے بعد معاملات کے ابواب رکھے اور سب سے آخر میں ترکہ و میراث کا ذکر کیا۔ طہارت و نماز کا ذکر مقدم اس لئے کیا وہ سب سے اہم اور سب سے عام عبادت ہے اور معاملات کو عبادت کے بعد رکھا کیونکہ اصل میں کسی شخص پر معاملات کی کوئی پابندی نہیں ہوتی اور ہر شخص بری الذمہ ہوتا ہے (جب تک کہ اس کا خصوصی ثبوت نہ ملے) اور وصیت اور میراث کو سب سے آخر میں رکھا کیونکہ وہ انسانی احوال میں سب سے آخری

چیز ہیں۔ (موفق ۱/۱۶۲)۔

کہتے ہیں کہ ابو حنیفہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے کتاب الفرائض اور کتاب الشروط وضع کیں۔ ان سے پہلے اس پر مستقل بحث کسی نے نہ کی تھی (موفق ۱/۱۰۵)۔

قانون بین الملک کو بھی انہوں نے ایک مستقل چیز قرار دیا اور کتاب السیر مرتب کی جس میں قوانین جنگ و امن سے بحث تھی اور اس کو تاریخ سے الگ کر کے فقہی چیز قرار دیا۔ اس پر معاصرین میں بحثیں خوب چھڑیں اور امام اوزاعی نے اس کی تردید لکھی۔ ابو یوسف نے اس کا جواب لکھا اور یہ آخری رسالہ الرد علی سیر الاوزاعی کے نام سے اب حیدرآباد میں چھپ چکا ہے۔ امام محمد شیبانی نے بھی سیر صغیر لکھی اور پھر سیر کبیر جو اتنی بڑی تھی کہ ایک گاڑی میں ڈال کر لیجائی گئی تاکہ ہارون رشید کو تحفہ دی جائے (مقدمۂ ناشر الرد علی سیر الاوزاعی لابی یوسف نیز شرح السیر الکبیر للشیبانی ج۱ میں سرخسی شارح کی تمہید)۔

ایک بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس مجلس چہلگانہ کے علاوہ ایک مختصر تر دس آدمیوں کی ایک کمیٹی بھی تھی۔ محمد بن وہب جو پہلے اہل حدیث سے تھے بعد میں ابو حنیفہ کے معتقد ہو گئے وہ اس کمیٹی کے رکن تھے اور "ان دس آدمیوں ہی نے فقہی ابواب مدون کئے تھے" (کردری ۲/۱۰۸،۱۶۱ صیمری ورق ۸۴/ب تا ۸۵/ا)۔

صیمری نے ایک خاص الخاص مجلس چہارگانہ کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے کہ "ابو حنیفہ کے حلقے میں ہمیشہ رہنے والے دس تھے لیکن جس طرح لوگ قرآن کے حافظ ہوتے ہیں اسی طرح فقہ کے حافظ ان میں چار ہی تھے: زفر، یعقوب، اسد بن عمرو اور علی بن مسعر" (صیمری ورق ۵۴/ا)۔

حضرت عبد اللہ بن مبارک مستقل طور سے کوفے میں نہیں رہ سکتے تھے۔

ان کا بیان ہے کہ میں ابو حنیفہ کی ایک ہی کتاب کو کئی کئی بار تحریر کرتا تھا کیونکہ اس میں اضافے ہوتے رہتے تھے جن کو میں لکھ لیا کرتا تھا۔ ان کی زفر سے بڑی دوستی تھی اور کوفہ آکر انہیں سے ابو حنیفہ کی کتابیں مستعار لیتے اور نقل کر لیتے تھے (موفق ۲/۹۸ صیمری ورق ۱۰۳ ب)۔

ابو حنیفہ کی فقہی کتابوں کا مطلب اصل میں ان لکچروں کی یادداشتیں ہیں جو مختلف ابواب فقہ پر ہوتے تھے اور جو ان کے شاگرد مرتب کرتے رہتے تھے محمد شیبانی کے متعلق جو بیان کیا جاتا ہے کہ انہوں نے ستائیس ہزار مسائل قیاسی طور سے مدون کئے تھے (کردری ۲/۱۵۹) اس میں بہت کچھ ان کے استاد کے لکچروں سے بھی ماخوذ ہوگا۔ امام مالک کا بیان ہے کہ ابو حنیفہ نے ساٹھ ہزار مسائل میں رائے ظاہر کی تھی (موفق ۱/۹۵) بعض لوگوں نے اس تعداد کو پانچ لاکھ تک پہنچا دیا ہے۔ (موفق ۲/۳)

چونکہ سیرت النبی خاص کر غزوات کے ذکر کے متعلق ابو حنیفہ کے زمانے میں اتنی احتیاط اور چھان بین نہیں کی جاتی تھی جتنی عام حدیث کے متعلق اس لئے وہ اہل سیرت کے متعلق بدگمان سے رہتے تھے اور اپنے شاگردوں کو بھی منع کرتے تھے کہ ابن اسحاق جیسے ماہر فن سے تک نہ ملیں۔ لیکن جب ان کے بعض شاگردوں نے عذر کیا کہ سیرت دانی کے بغیر مقدم و موخر اور ناسخ و منسوخ سوانح نبوی معلوم نہیں ہو سکتے اور سیرت کے مبادی نہ معلوم ہونے سے بڑے سے بڑا فقیہ بھی مضحکہ خیز غلطیاں کر جاتا ہے تو حق پسند ابو حنیفہ چپ ہو گئے (موفق ۲/۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۲ کردری ۲/۱۴۷) اور ابو حنیفہ کے دونوں سب سے بڑے شاگرد ابو یوسف اور محمد شیبانی تو واقدی جیسے مقابلۃً افسانہ نویس سے تاریخ و سیرت میں مدد لینے میں حرج نہیں سمجھتے تھے (موفق ۲/۲۳۹ کردری ۲/۱۴۱، ۱۴۲، ۱۴۳، ۱۵۱)۔

امام شافعی جیسے ماہر فن نے کیا خوب کہا ہے کہ لوگ پانچ آدمیوں کے محتاج ہیں۔ جو مغازی نبوی میں تبحر چاہتا ہے وہ ابن اسحاق کا محتاج ہے، جو فقہ میں تبحر چاہتا

ہے وہ ابوحنیفہ کا محتاج ہے (ایک روایت میں الفاظ یہ ہیں "جو قیاس و استحسان میں تبحر چاہتا ہے")۔ موفق ۱/۴۲ نیز صیمری ورق ۱۱/ب) جو شاعری میں تبحر چاہتا ہو وہ زہیر کا محتاج ہے، جو تفسیر میں تبحر چاہتا ہے وہ مقاتل بن سلیمان کا محتاج ہے، اور جو صرف و نحو میں تبحر چاہتا ہے وہ کسائی کا محتاج ہے (موفق ۱/۵۹)۔

اس سرسری تذکرے کے آخر میں ایک سوال کا جواب بے محل نہ ہوگا کہ کس حد تک اسلامی فقہ کی تدوین میں بیرونی اثرات ہیں؟

ایک طرف ہمارے یورپی مولف ہیں ان کے نزدیک دنیا کی کوئی اچھی چیز کسی مشرقی سے ممکن ہی نہیں ان کا بیان ہے بلکہ ادعا ہے کہ اسلامی فقہ صرف قانون روما کی معرب شکل کا نام ہے اور وجہ سوائے اس کے کچھ نہیں کہ ان کا جی چاہتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مجھے علم نہیں کہ بیرونِ ہند مسلمان ماہرین قانون نے جائزہ لینے میں اس پر کچھ تحقیق کی ہو۔ ہند کی حد تک امیر علی اور عبدالرحیم نے باوجود اپنی اعلیٰ قابلیتوں کے اس بارے میں کوئی محنت اور کوشش نہ کی اور قانون اسلام پر اپنی تالیفوں میں "ممکن ہے کہ" اور "شاید کہ" وغیرہ الفاظ کے ساتھ چند سطروں میں یورپی مولفوں کے خیالات ہی کو درا نرم پیرائے میں دہرا دیا ہے۔

ایک طرف یہ اور دوسری طرف ہمارے بعض قدامت پرست مولفوں کو قانون روما کے نام سے اتنی چڑ ہو گئی کہ اس سے واقفیت بھی پیدا کئے بغیر اس کے وجود سے انکار کر بیٹھے ہیں۔ اردو کے ایک مشہور مولف سے جن کا نام لینے کی ضرورت نہیں یہ لکھنے کی توقع نہ تھی کہ قانون روما صرف ایک ایک سطری بارہ اصولوں کا نام ہے۔ حالانکہ دوگانہ کا مرتب کردہ بارہ الواح کا ابتدائی رومی قانون تک بارہ جملوں سے کہیں زیادہ پر مشتمل ہے۔ بعد کے زمانے میں گایوس اور جسٹی نین کے تدوین کردہ مجموعے اب بھی قانون بھی کافی ضخیم ہیں۔ اگر فقہ پر قانون روما کا اثر پڑا تو فقہ کی قیمت گھٹ نہیں جاتی اور اگر اثر نہیں پڑا تو انکار

موجودہ قیمت میں کوئی اضافہ نہیں ہو جاتا۔ بیرونی اثرات کو نہ توڑ توڑ بنا دینا چاہیئے نہ ڈھکو سلا بلکہ واقعات کو دیکھنا چاہیئے کہ اصل میں کس طور سے پیش آئے تھے میں اوپر اشارۃً بیان کر چکا ہوں کہ فقہ کی توسیع و ارتقاء میں بیسیوں بیرونی ماخذوں سے مدد لی گئی ہے قران و حدیث نے جن چیزوں کو حرام کر دیا اسے کسی بیرونی اثر نے جائز نہیں بنایا اور جو چیزیں واجب قرار دی گئی تھیں بیرونی اثرات کبھی ان کو سلمانوں کے نزدیک ناجائز نہیں قرار دے سکتے صرف جن چیزوں سے قران و حدیث ساکت تھے ان کے متعلق سلف کی روایات جو قران و حدیث کے الفاظ اور روح کے خلاف نہ تھے قبول کئے گئے یا جاری رہنے دیئے گئے خود قرآن نے حضرت موسیٰ وعیسیٰ وغیرہ ایک درجن سے زاید پیغمبروں کا نام لے کر آخر میں حکم دیا کہ فَبِهُدَاهُمُ اقْتَدِهْ (ان کی ہدایت پر چلو) اسی طرح جب پیغمبر اسلام کے متعلق لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ کے الفاظ استعمال کئے تو بعینہٖ یہی الفاظ حضرت ابراہیم کے متعلق بھی اور عام طور پر دیگر پیغمبروں کے متعلق بھی قرآن نے استعمال کئے۔ توریت وانجیل وغیرہ کی قانونی حیثیت قران نے تسلیم کی تو ان کے متعلق پیغمبر اسلام کا یہ طرز عمل بخاری ترمذی وغیرہ میں مروی ہے کہ اگر کسی بات کے متعلق آپ کو راست وحی نہ آتی تو آپ اہل کتاب کے رواج پر عمل کرنا پسند کرتے۔ مسند احمد بن حنبل میں ایک اور دلچسپ حدیث غیر اہل کتاب کے متعلق یوں مروی ہے کہ "یُعْمَلُ فِی الاسلام بفضائل الجاھلیۃ" (اسلام میں زمانۂ جاہلیت کی اچھی باتوں پر عمل کیا جائیگا) حج جیسے رکن اسلام کے متعلق کون نہیں جانتا کہ وہ بجنسہٖ زمانہ جاہلیت کا ادارہ ہے جس کی اسلام میں مشرکانہ اور نامناسب رسمیں حذف کر دی گئیں اور یہ کہنا دشوار ہے کہ زمانہ جاہلیت کی جن چیزوں کو اسلام نے برقرار رکھا وہ سب کی سب انبیاے سلف اور خاص کر حضرت ابراہیم کی سنت تھیں۔ خون بہا کے سو اونٹ کے متعلق سب جانتے ہیں کہ عبدالمطلب نے ایک کاہنہ کی تجویز پر قبول اور رائج کئے تھے غرض اس میں کوئی امر مانع نہیں کہ خود

مشرک عربوں کے اپنے رواجات میں بھی کچھ معقول چیزیں ہوں جن کو اسلام نے جاری رہنے دیا۔ عہد نبوی کے بعد مسلمان مختلف ممالک میں پھیلے تو ان کو ناگزیر نئی نئی ضرورتوں اور نئے نئے رواجات سے سابقہ پڑا اور فقہا نے یقیناً ان میں سے چند کو جو معقول تھے اور قرآن وحدیث کے غیر معارض تھے جاری رہنے دیا یا قبول کر کے فقہ کا جزو بنا دیا۔ ان حالات میں اگر غریب قانون روما کا بھی کچھ اثر پڑا تو کونسی نئی بات ہوگی؟ میں تو کہتا ہوں کہ شام و مصر کے ابتدائی فقہا نے رومی رواجات قبول کئے ہونگے تو عراق و ایران کے فقہا نے ایرانی رواجات، اپینی فقہا نے اندلسی اور گاتھک رواجات اور ہندی فقہا نے دھرم شاستر سے متاثر رواجات۔ یقیناً یہ تمام رواجات صرف ان چیزوں کے متعلق قبول کئے گئے جن کے متعلق قرآن وحدیث خاموش تھے اور جن کے خلاف کوئی صریح حکم نہیں تھا فقہاء نے یہ رواجات معقول اور قیاساً درست سمجھے اور قرآن وحدیث کے مطابق ہونے کے باعث قبول کئے۔ جب ہم یہ سب ماخذ تسلیم کرنے آمادہ ہیں تو خود ہی یہ سوال حل ہو جاتا ہے کہ قانون روما کا حصہ کتنا تھا۔

لیکن اسی قدر نہیں بعض اور چیزیں وضاحت چاہتی ہیں۔ اسلامی قانون کو مکے اور مدینے کے رواجات سے سب سے پہلے سابقہ پڑا خاص کر مدینے میں یہودی کثرت سے رہتے تھے۔ مکے کے لوگ تجارت کے لئے جہاں شام و مصر وحبشہ جاتے تھے، وہیں وہ عراق اور یمن اور عمان بھی جاتے تھے۔ شام و مصر میں رومی اور عراق میں ایرانی حکومت کے قوانین سے وہ دوچار ہوئے تھے۔ یمن جس نے بعد میں اسلامی قانون کی ترقی میں بڑا حصہ لیا ہے ایسا علاقہ تھا جس میں نہ صرف ایک اس کا اپنا نہایت قدیم تمدن تھا بلکہ وہ یکے بعد دیگرے اسلام سے کچھ ہی پہلے، یہودیوں، حبشی رومیوں اور ایرانیوں کی حکومت میں رہ چکا اور ہر ایک سے کچھ نہ کچھ تاثرات حاصل کر چکا تھا۔ حجاز، یمن، بحرین، عمان وغیرہ ساحلی علاقوں کو چھوڑ کر اندرون عرب نے بے شبہہ اجنبی اثرات

ناپید سے تھے لیکن عہد نبوی میں اسلامی مملکت نے بیرون میں پھیلنے کا جو آغاز کیا وہ دس پندرہ ہی سال بعد حضرت عثمان کے زمانے میں مغربی چین سے لے اندلس کے کچھ حصے تک پہنچ گئی اور اس وسیع مقبوضہ علاقے میں صرف رومی قانون رائج نہ تھا بلکہ بہت سے دیگر مستقل تمدن بھی تھے۔ حضرت عمر نے عراق میں قدیم ایرانی قانون مالگزاری باقی رہنے دیا تھا جیسا کہ مسعودی کا بیان ہے اور کوئی تعجب نہیں جو شام و مصر میں رومی نظام ہی باقی رکھا گیا ہو۔ حضرت عمر نے خاص کر چنگی وغیرہ مسائل کے لئے حکم دے رکھا تھا کہ بیرونی مسافروں سے وہی برتاو کیا جائے جو ان کے ملک میں مسلمان مسافروں کے متعلق ملحوظ ہو۔

خصوصی معاہدات کے ذریعہ سے بھی قانون انتظامی کے مختلف اجزا خلافت راشدہ اور اس کے بعد ہمیشہ نافذ ہوتے رہنے کو فقہیت کا مرکز تھا اور یہ ایرانی علاقے میں تھا۔ بنی امیہ برسر اقتدار آئے تو فقہی امام زیادہ تر حجاز میں رہے۔ وہاں رومی اثرات معدوم کہے جا سکتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ کے متعلق ہم جانتے ہیں کہ وہ ایرانی النسل ورنہ کم از کم ایرانی الوطن تھے اور ان کی زندگی زیادہ تر کوفہ کہ بغداد کے غیر رومی علاقوں میں گزری اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا کہ قانون روما کا راست یا بالواسطہ کبھی اس دور میں عربی میں ترجمہ ہوا ہو۔ قانون اسلام سے بیرونی اثرات کو کم کرنے کے لئے ابتدا ہی سے ایک انقلابی اصول قرآنی احکام کے تحت نافذ کر دیا گیا تھا کہ ہر مذہب کے لوگ اپنے قانون شخصی کے پابند رہیں اور ان کو عدل گستری ان کی اپنی خصوصی عدالتوں میں ان کے اپنے ہم مذہب حکام کے ہاتھوں ہو اور اسلامی قانون کے وہ پابند نہ ہوں۔

میں نے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ کم از کم ابتدائی فقہی کتابوں کی ترتیب ہی قانون روما کے مماثل ہے۔ قانون روما زمانہ قبل مسیح ہی سے عبادات کو معاملات سے

انگلستان تھا اور دنیاوی معاملات کا قانون اشخاص، اشیاء اور ضابطہ (persons, things & actions) کے تین حصوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ ہم ابھی دیکھ چکے ہیں کہ ابوحنیفہ کی ترتیب عبادات معاملات اور جنایات کے تین حصوں میں بٹی ہوئی تھی جس میں قوانین عمومی یعنی دستور اور انتظام مملکت بھی شامل تھے اور ان کی یہ ترتیب رومی قانون کی ترتیب سے بنیادی اختلاف رکھتی ہے۔ ابوحنیفہ کا زمانہ بنی امیہ کے آخری اور بنی عباس کے ابتدائی دور پر مشتمل تھا اور ابھی یونانی علوم و فنون کا زیادہ ترجمہ اور رواج نہیں ہوا تھا پھر بھی جو کچھ رواج ہوا ہو اس سے ممکن تھا کہ چند فنی اصطلاحیں لی گئی ہوں لیکن منطق و فلسفہ طب و نجوم کلام و جغرافیہ وغیرہ کے برخلاف اصول فقہ میں کوئی معرب اصطلاح کسی زبان میں نہیں ملتی نہ لاطینی نہ یونانی نہ فارسی نہ کوئی اور۔ جتنے بھی الفاظ ہیں وہ قدیم عربی ہی کے مروج الفاظ ہیں اور اکثر قرآنی الفاظ ہیں مثلاً فقہ، شرع، سنت وغیرہ جن کو اصطلاح کی حیثیت دی جانے لگی تھی معاملات و کاروبار تجارت میں چند غیر عربی اصطلاحیں ملتی رہیں لیکن وہ بھی غالباً اسلام سے پہلے ہی عربی میں آچکی تھیں امام مالک نے موطا میں ابواب کی جو ترتیب رکھی ہے وہ امام ابوحنیفہ کی ترتیب سے مختلف ہے اور عبادات و معاملات سب خلط ملط ہیں جیسے امام زید بن علی کے مجموع الفقہ کو اس مضمون کے لکھتے وقت مکرر دیکھنے کا موقع نہ ملا لیکن اس کی بھی ایک مستقل ترتیب ہے گو وضو یا نماز ہر ایک کے ان سب سے مقدم ہے کیونکہ حدیث نبوی میں اسے دین کا ستون قرار دیا گیا تھا۔ ان تینوں معاصر فقہاء کی تالیفوں میں ابواب کی ترتیب کا بے انتہا اختلاف بتاتا ہے کہ ترتیب میں بھی ان کے سامنے کوئی بیرونی نمونہ نہ تھا اور ہر کوئی اپنی ذہنی جولانی سے اپنے لئے کوئی خاکہ پسند کر رہا تھا۔ امام شافعی اور امام حنبل کا زمانہ نسبتاً بہت بعد کا ہے ان سے یہاں بحث کی ضرورت نہیں البتہ یہ قابل ذکر ہے کہ رومی ترتیب کسی بھی اسلامی

فقہ نے اختیار نہیں کی۔ قانون روما اور قانون اسلام میں بنیادی فرق بھی کم نہیں۔ رومی بت پرست اور مشرک تھے تو مسلمان وحدانیت کے لئے اٹھے۔ روما میں پدری سلطنت معاشرتی نظام کی بنیاد تھی (پوسٹ کا مقدمہ انسٹیوٹ آف گایوس ۱ ۵۵) عربوں میں یہ چیز نہ زمانہ جاہلیت میں تھی نہ زمانہ اسلام میں۔ قانون روما اس قدر لکیر کا فقیر تھا کہ اس کی ملال برداشت کرنے والی ضابطہ پرستی (tedious formalities) کبھی بھی دور نہ ہو سکی۔ مثال کے طور پر گایوس کے نسبتاً جدید ا دوسری صدی عیسوی کے مجموعہ قانون میں حکم ہے کہ اگر کوئی شخص اپنی درخواست میں انگور کی بیل لکھے تو مقدمہ خارج ہو جائے کیونکہ قانون دوازدہ الواح میں انگور کے درخت کی اصطلاح آئی ہے (گایوس ۴ / ۱۱) مقدمہ بازی میں دعوے اور جواب وغیرہ میں الفاظ بلکہ حرکات تک ناقابل تبدیل تھے۔ (پوسٹ صد ۲۳)

خود جس چیز کو رومی قانون کہا جاتا ہے وہ بھی خالص رومی چیز نہیں ہے، بلکہ غیر قوموں سے تماس نے "قدیم پست" (primitive) قواعد کو بدلنے پر آمادہ کیا۔ آخر افریقہ سے بارت پھر ایشیائے کوچک کے تمدن سے سابقہ مشرقی اثرات کو رفتہ رفتہ قانون روما میں رچانے اور اسے مہذب بنانے کا باعث ہوئے (پوسٹ صد ۳۴ تا ۳۵۔ انسائیکلوپیڈیا آف سوشیل سائنسیس عنوان کارپس جوریس سویلیس)

ابتدا میں قانون روما فاس (Fas) یا قانون مراسم مذہبی پر مشتمل تھا اور دیوتا ہر انسانی معاملے میں دلچسپی لیتے سمجھے جاتے اور پجاری بر اختیار تھا ۔ ۱۵۱ ق م تا ۴۵۱ ق م میں قانون دنیاوی (Jus) کو الگ کر کے اس کا تعلق کشوری انتظامات سے کر دیا گیا۔ چنانچہ مجلس دہگانہ نے قانون دوازدہ الواح مرتب کیا جس میں کالا دو بانہ کے متعلق نیز دستور مملکت کے متعلق احکام تھے (پوسٹ صد ۱۱ / ۲)۔

رفتہ رفتہ حکمرانوں نے قانون سازی کے اختیارات حاصل کر لئے ۔ اسلام میں پجاریوں کا نظام کبھی آیا ہی نہیں اور قرآن و حدیث کے خلاف قانون سازی کا کبھی کسی کو اختیار رہی نہیں ملا۔ قانون روما میں نکاح اور غلامی کے متعلق جو اخلاق سوز اور ظالمانہ احکام تھے وہ اسلام میں کبھی نہ آسکے ۔ نکاح اور غلامی کے متعلق بہت سے اسلامی ادارے قانون روما میں کہیں نہیں ملتے گو چند ادارے مشترک ضرور ہیں لیکن وہ نئے نہ تھے بلکہ قدیم سے عرب میں رائج تھے یا پیغمبر اسلام نے ان میں اصلاح کی تھی۔

بے شبہ ابتدائی فقہی کتابوں کے نام مثلاً مجموع، جامع، مدونہ، مبسوط، اصل، ام، حاوی code, compendium, Pandects, principles, institutes, corpus وغیرہ کے ہم معنی معلوم ہوتے ہیں لیکن ایک تو یہ ممکن تھا اس مفہوم کو ادا کرنے کے لئے عرب مولفوں کے ذہن میں یہ نام خود ہی آ گئے ہوں کیونکہ عربی میں ان کے سوا کوئی اور نام ہو بھی نہیں سکتے اور دوسرے جسٹی نین کی تدوینات بھی جو پورے قانون روما پر حاوی ہیں امام مالک یا امام محمد شیبانی کی کتابوں سے حجم یا تنوع میں کچھ بہت بڑھے ہوئے نہیں ہیں بلکہ عبادات کو مقابلے سے حذف بھی کر دیں تو معاملات میں ایسے بہت سے ابواب ہیں ان اسلامی کتابوں میں ملتے ہیں جن کا ذکر قانون روما میں بالکل نہیں ہے۔ امام محمد کی کتاب المبسوط اگر چھپ جائے تو دو ڈیڑھ ہزار صفحوں سے کم میں نہ آئے۔ موطا امام مالک کے مختلف ایڈیشن بھی خاصے بڑے ہیں اور یہ بالکل ابتدائی فقہی کتابیں ہیں ورنہ پانچویں صدی ہجری میں سرخسی نے امام محمد کی کتاب کے خلاصے کی جو شرح مبسوط کے نام سے لکھی وہ بڑی تقطیع کی پوری تیس جلدوں میں چھپ سکی اور ہزار سالہ ارتقاء پر جسٹی نین نے پچاس ابواب کا جوڑا انتخاب مرتب کرایا اس سے

صرف سو سالہ ارتقا پر قانون اسلام تنوع کی حد تک اچھی طرح مقابلہ کر سکتا ہے بلکہ بہت سے امور میں زیادہ مہذب اور موافقِ اخلاق ہے غور کرنے پر یہ بھی نظر آتا ہے کہ اگرچہ بنی امیہ کا پائے تخت دمشق رومی علاقے میں تھا، لیکن ان کے زمانے میں اہل علم و قلم یا تو حدیث کو جمع اور مرتب کرنے میں منہمک ہے یا ادبیات یا صرف نحو پر توجہ کی۔ فقہ سے شوق عہد بنی عباس میں شروع ہوا جو ایرانی ماحول میں رہتے تھے اور بغداد میں اپنا تخت منتقل کر چکے تھے لیکن بدقسمتی سے ایرانی قوانین کے متعلق جدید ترین مغربی تحقیقات بھی یہ ہے کہ وہ قانون روما کے مقابل بہت فروتر تھے۔ مجھے نہیں معلوم کہ ان کے آئین نامہ وغیرہ کی ترتیب و کیفیت کیسی تھی۔ ولسن وغیرہ کی تحقیق میں تو عہد نبوی اور آغاز اسلام کے وقت مشرق میں قانون روما سرے سے رائج ہی نہ تھا اور مشرقی رواجات اور پادریانہ تحکیمات ہی کا دور دورہ تھا۔ قانون روما کا احیاء صدیوں بعد نشاۃ ثانیہ میں شروع ہوا چنانچہ:-

"It may be doubted whether Justinian's immediate subjects derived any very great benefit from the Corpus juris. Most of it was in Latin, whereas the bulk of them spoke Greek, and some Syriac or Arabic. It was repeatedly and capriciously altered by the legislator himself during the last thirty years of his reign. And there are other reasons for supposing that the Imperial enactments of this period seldom made themselves felt much beyond the chief centres of administration, and that in the outlying districts of the Eastern provinces the regular tribunals were less resorted to than clerical arbitrators, the bishops and presbyters of the different sects, whose legal notions were

derived at second or third hand form the older Roman law sources with an admixtures of other elements."
(Wilson, Anglo-Muhammadan Law. ed. 1894, p. 6.)

ترجمہ:-

"یہ امر مشتبہ ہے کہ جسٹی نین کی اصلی رعایا نے اس کے مجموعۂ قوانین سے کوئی بہت بڑا فائدہ اٹھایا ہو کیونکہ ان قوانین کا بڑا حصہ لاطینی زبان میں تھا اور رعایا میں سے اکثر یونانی بولتے تھے اور کچھ سریانی یا عربی۔ پھر خود قانون ساز ہی اپنی حکومت کے آخری تیس سالوں کے دوران میں بار بار اور کسی قدر بے اصولی کے ساتھ ان قانونوں کو بدلتا رہا۔ ان کے علاوہ اور بھی وجوہ ہیں جن کی بنا پر یہ رائے قائم کرنی پڑتی ہے کہ اس عہد کے شہنشاہی قوانین بڑے بڑے شہروں کے نظم و نسق کے باہر محسوس بھی نہیں ہوتے تھے اور مشرقی صوبوں کے دور دراز اضلاع میں باقاعدہ عدالتوں میں لوگ اتنا رجوع نہیں ہوتے تھے جتنا پادریوں، اسقفوں اور مذہبی افسروں کے پاس ثالثی کے لئے اور ان ثالثوں کے قانونی تصورات قدیم قانون روما کے ماخذوں پر دوسرے یا تیسرے واسطے سے مبنی تھے اور ان رومی ماخذوں میں بھی دیگر عناصر شامل تھے۔"

غرض قانونِ اسلام پر قانونِ روما کا اثر پڑا یا نہیں؟ اس سوال کے جواب میں تائید میں صرف ایک امکان پیش کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے اپنے قانون کی ترقی و تدوین کے آغاز ہی میں ان علاقوں پر قبضہ کر لیا جہاں پہلے رومی یعنی بیزنطینی حکومت تھی۔ اس علاقے کے نو مسلموں کا اور عام طور پر اس علاقے کے رواجات سے قرآن و حدیث کے سکوت کے وقت فقہا کا مسائل اخذ کرنا

ممکن ہے۔ اس ایک امکان کے مقابل بارہ واقعات ناقابل نظر اندازی ہیں۔

۱۔ مرجع قانونِ اسلامی یعنی جناب رسالت صلی اللہ علیہ وسلم کو نہ تو وہ زبانیں آتی تھیں جن میں قانون رومالکھا ہوا تھا اور نہ آپ کا قیام ان علاقوں میں رہا جہاں وہ قانون رائج تھا۔

۲۔ اسلامی قانون کی بنیاد اولاً اپنی پیدائش گاہ کے رواجوں پر ہونی چاہیے۔ حجاز میں رومی اثرات کبھی نہ آئے۔

۳۔ تمام ابتدائی اسلامی مذاہبِ فقہ حجاز یا عراق یعنی غیر رومی علاقوں میں پیدا ہوئے اور پھلے پھولے واحد استثنا امام اوزاعی کا ہے لیکن ان کا مذہب ان کے ساتھ ہی ختم ہو گیا۔

۴۔ بے شبہ اموی دور میں دارالخلافہ دمشق کے رومی علاقہ میں تھا لیکن اموی دور میں فقہ سے زیادہ تفسیر، حدیث، تاریخ، طب وغیرہ پر توجہ ہوئی۔ فقہ کا مرکز اموی دور میں بھی کوفہ اور حجاز ہی تھے۔ عباسی دور میں فقہ سے توجہ ہوئی تو دارالخلافہ عراق میں منتقل ہو گیا تھا۔

۵۔ منطق، فلسفہ، جغرافیہ طب اور الاہیات وغیرہ کے برخلاف فقہ میں کسی زمانے میں بھی معرّب اصطلاحیں نہیں ملتیں بلکہ سب کی سب خالص عربی اصطلاحیں ہیں جو قرآن یا حدیث کے الفاظ سے ماخوذ ہیں۔

۶۔ اور علوم کے برخلاف فقہ کی تدوین و ترقی کے زمانے میں قانون کی کسی بیرونی کتاب کے عربی میں ترجمے کا کوئی ذکر نہیں ملتا اور نہ ایسے فقہا ملتے ہیں جو رومی قانون کی کتابوں کو پڑھنے کے لئے اجنبی زبانوں مثلاً لاطینی، یونانی یا سریانی سے واقف ہوں۔

۷۔ قریب قریب تمام مشہور فقہا غیر رومی علاقوں سے پیدا ہوئے۔ حجاز کے بعد سب سے زیادہ ایران اور ترکستان نے فقہا کو پیدا کیا۔ یہاں ایرانی اور بدھی قانون

تو ہونگے لیکن رومی اثرات نہیں۔

۸۔ حضرت عمر نے چنگی اور مالگزاری کے قواعد غیر رومی علاقوں سے اخذ کئے تھے۔ جزیہ تک بھی قدیم ایران میں ملتا ہے، رومی علاقوں میں نہیں۔ قاضی القضاۃ کا عہدہ بھی ایرانی تھا۔

۹۔ قرآن نے صراحت سے حکم دیا ہے کہ ذمی رعایا کو قانونی اور عدالتی خودمختاری حاصل ہو۔ اس پر عہد نبوی ہی سے عمل شروع ہو گیا اور عثمانی دور تک باقی رہا۔ اس کا اگر نتیجہ مسلمانوں اور ذمیوں کے نظام ہائے قانون کی ایک دوسرے سے جدائی اور باہم عدم ردعمل سے علاحدگی رہی۔

۱۰۔ فتوحات اسلامی کے آغاز ہی پر مسلمانوں نے وقت واحد میں ایرانیوں اور رومیوں دونوں پر ایک ساتھ حملہ کر کے دونوں کو ایک ساتھ زیر کیا تھا۔ یہ کہنا کہ مفتوحوں میں سے صرف رومیوں کا اثر فاتحوں پر پڑا اور اسپین سے چین تک اور آرمینیا سے ہندوستان تک جو دیگر مفتوح اقوام تھے ان کے رواجات کا اثر نہ پڑا محض ترجیح بلا مرجح ہے۔

۱۱۔ اسلامی تمدن اور رومی تمدن میں بنیادی فرق بھی بہت ہیں۔ جہاں تک میں تقابلی مطالعہ کر سکا عبادات (یعنی توحید، نماز، روزہ، حج، زکات) تعزیرات، مالیات قرض و سود، وراثت، نکاح، طلاق، نسب، خلع، غلاموں کی آزادی، عدل گستری، قانون بین الممالک وغیرہ میں کوئی مماثلت نہیں ملتی۔ ہے دے کر کچھ حصہ معاملات کا رہ جاتا ہے۔ ان کی مماثلت کے اسباب کی تلاش سے قطع نظر غیر مماثل اجزا کے وجود سے اتنا تو ضرور ثابت ہوتا ہے کہ قانون اسلامی کے بہت بڑے حصے پر قانون روما کا بالکل اثر نہیں ہے۔

۱۲۔ آغاز اسلام پر قانون روما مشرقی رومی یعنے بیزنطینی سلطنت میں رائج ہی نہ تھا بجز چند صوبہ وار صدر مقاموں کے اور پادریوں نے عدل گستری اور تحکیم و ثالثی اپنے ہاتھ میں لے لی تھی اور مذہبی یا خود غرضانہ وجوہ سے غیر عیسائی رومی قانون سے رجوع کرنا وہ پسند نہ کرتے تھے۔

میں نے ایک مستقل مقالے[1] میں یہ تحقیق کرنے کی کوشش کی ہے کہ قانون روما کے اثرات قانون اسلامی پر ہوئے یا نہیں۔ میں مذکورہ بالا خلاصۂ دلائل سے اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہوں کہ فقہاء نے بیرونی مصادر سے استفادہ ضرور کیا لیکن ان بیرونی مصادر میں قانون روما کا حصہ اتنا کم ہے کہ اسے کوئی خصوصی اور امتیازی جگہ نہیں دی جا سکتی اور شاید یہ کہنا بہت زیادہ مبالغہ نہ ہوگا کہ قانونِ اسلام کے بیرونی اثرات میں قانون روما کا حصہ مشکل سے سوّاں حصہ $\frac{1}{100}$ ہوگا فقط

محمد حمید اللہ

کتابیات

مضمون میں ہر جگہ حوالے دیئے گئے ہیں بطور خاص:

۱۔ مناقب ابی حنیفہ للصیمری (مخطوطہ استانبول۔ فوٹو در کتب خانہ احیاء المعارف النعمانیہ حیدرآباد دکن۔)

۲۔ مناقب ابی حنیفہ للموفق } دونوں یکجا دو جلدوں میں، دائرۃ المعارف حیدرآباد
۳۔ " " للکردری } نے چھاپے ہیں۔

۴۔ فتح المغیث للبغدادی

۵۔ سیرۃ النعمان (اردو) مولفہ شبلی

۶۔ المبسوط للسرخسی

۷۔ پوسٹ کا انگریزی مقدمہ گابوس کی لاطینی کتاب "مجموعہ قانون" پر

۸۔ وِسی کی انگریزی کتاب انگلو محمڈن لا۔

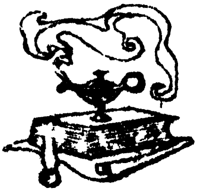
۹۔ شیلڈن اموس کی انگریزی کتاب "تاریخ و اصول قانون روما"

---

[1] دیکھئے ذیل میں کتابیات نمبر ۱۱

۱۰- ڈاکٹر حامد علی کا مضمون مدراس نے کلیۂ قانون کے رسالے میں "قانون روما کا اثر اسلامی اصول قانون پر"

۱۱- میرا مقالہ موتمر مستشرقین ہند کے اجلاس حیدرآباد (سنہ ۱۹۴۱ء) میں۔



قرونِ وسطیٰ میں عرب اور عجم کے حکماء کی علمی تحقیقات

قدیم تہذیبوں کی تاریخ کا پتہ چلانے والوں کی متفقہ رائے ہے کہ انسان کی متمدن زندگی سب سے پہلے شط العرب اور دریائے نیل کے کناروں پر شروع ہوئی اور پھر آہستہ آہستہ تمام دنیا میں پھیل گئی۔ خالدیہ، بابل اور فنیقیہ کے علمی انکشافات جو ہزارہا برس کے اتفاقیہ تجربوں کے ذریعہ منتشر اور پراگندہ حالت میں بنی نوع انسان کو بطور میراث نصیب ہوئے تھے کرشمہ قدرت سے ایونیا اور یونان کی سرزمین میں چھ سات سو برس کی مدت میں قبل ولادت حضرت مسیحؑ مرتب و مدون ہو کر حکمت، فلسفہ، فنون لطیفہ و تعمیر کی شکل میں رونما ہوئے۔

یونان کا علمی چراغ جس سرعت کے ساتھ چمک اٹھا تھا اس کے باشندوں کے عدم مرکزیت کی وجہ سے اتنا ہی جلد مدھم پڑ گیا لیکن بجھنے سے پہلے اسکندریہ کو اس قدر روشن کیا کہ اس کی ضیاء سے دنیائے علم دو تین سو سال تک جہل کی تاریکی سے بچ گئی۔ اس کے بعد روما کا رتھ دنیا کے تمدن کو اگر ایک طرف منظم سررشتہ میں باندھ لیا تو دوسری طرف حکمت و فلسفہ، تحقیق و تجسس کو اپنی سرد مہری سے پستی کی حالت میں چھوڑ دیا۔

بالآخر روما کی قوت بھی زائل ہو گئی اور بربریت کا اندھیرا تمام متمدن دنیا پر چھا گیا۔ ایسے زمانہ میں جزیرہ نمائے عرب سے صداقت و حق پرستی کا نور مشرق سے لیکر مغرب تک برق کی طرح پھیلنے لگا اور آنحضرتؐ کی وفات سے ایک سو برس کے اندر ہی اندر تہذیب و تمدن عدل و انصاف کے ساتھ علم و ہنر کی پرورش عرب قوم کا جزو لاینفک بن گئی بنی امیہ کے تقریباً صد سالہ دور کے اختتام تک عرب چین سے لے کر بحر اٹلانٹک (ظلمات) تک حکمران ہو گئے۔ بحر و بر پر ان کا کوئی مدمقابل نہ رہا اگر وہ آپس کی خانہ جنگی کلبی و یمنی قبیلہ پروری کا شکار نہ بنتے تو کیا عجب کہ تمام ربع مسکوں پر تسلط پاتے بہرحال بنی امیہ ابھی علم و حکمت کی طرف پوری طرح متوجہ نہ ہوئے تھے کہ بنی عباس نے ۷۵۰ء میں ان سے عنان حکومت چھین لی۔ اسی وقت سے دنیائے علم کو بھی انہوں نے فتح کرنا شروع کر دیا۔

جیسا کہ الثعالبی (ف ۱۰۳۸ء) نے لطائف المعارف میں لکھا ہے اگرچہ ابو العباس السفاح بنی عباس کا پہلا خلیفہ تھا اس کا بھائی ابو جعفر المنصور اس خاندان کا حقیقی آغاز کرنے والا تھا۔ المامون اس کے وسطی دور کا قاید تھا اور المعتضد (۸۹۲ء - ۹۰۲ء) اس کو ختم کرنے والا تھا اگرچہ یہ خاندان المستعصم پر جو ۳۷ واں خلیفہ تھا ۱۲۵۸ء میں تاتاریوں کے ظلم و ستم سے ہمیشہ کے لئے مٹ جاتا ہے۔

ہمیں فتوحات اور جنگی کارناموں سے بحث کرنی مقصود نہیں ہے لیکن ضمناً ان کا تذکرہ آ ہی جاتا ہے۔ المہدی کے عہد میں عرب فوجیں ۷۸۲ء میں قسطنطنیہ کے دروازہ پر پہنچ گئیں اور اس جنگ میں ہارون الرشید نے ایسی شجاعت دکھائی کہ مہدی نے اپنے بڑے بیٹے موسیٰ الہادی کے بعد اس کو خلافت کا وارث قرار دیا۔ ہارون الرشید نے بھی اپنے دور خلافت میں روما کے غرور کو نیچا دکھایا نیسی فورس اول کو کامل شکست دی علاوہ ہرقلہ اور الطوانہ پر قبضہ کر لینے کے (۸۰۶ء) نہ صرف روما سے سابقہ مقررہ خراج وصول کیا بلکہ نیسی فورس کی ذات پر محصول عاید کیا۔ اس زمانہ میں بغداد کی جو شان و شوکت

تھی اس سے کون شخص واقف نہیں۔ الف لیلہ کی داستانوں میں ہارون الرشید کے دربار و اقتدار کے قصے اصل کی ناقص ترجمانی میں مبالغہ نہیں۔

ابوالفرج علی بن الحسین بن محمد بن احمد القریشی الاصفہانی (ل ۸۹۷ء - ف ۹۶۷ء) کی الاغانی، قرطبہ کے ابن عبد ربہ (۸۶۰ء - ۹۴۰ء) کی عقد الفرید اور ابن ابی یعقوب الندیم الوراق (ف ۹۹۵ء) کی الفہرست العلوم کے مطالعہ سے اس زمانے بغداد کی شان و شوکت اس کی وسعت تجارت اور ترقی صنعت و حرفت کا پتہ چلتا ہی جاتا ہے۔ یار بہر قدیم یونانی ایرانی اور ہندی علوم و فنون کا جو ایک عرصہ سے مٹ چکے تھے نہ صرف احیاء ہوا بلکہ جس طرح شہر بغداد تعمیر سے پچاس سال کے اندر دنیا کا سب سے بڑا اور دولت مند شہر بن گیا اسی طرح اتنی ہی قلیل مدت میں یہ مردہ علوم عربی زبان میں داخل ہو کر خود عرب دماغ کی اپنی تحقیق و کاوش سے ترقی کے راستہ پر لگ گئے۔

۷۶۵ء میں المنصور جب عارضہ شکم میں مبتلا ہوا تو جنوب مغربی ایران کے حالیہ قصبہ شاہ آباد کے قریب کے قدیم شہر جند شاپور کے مشہور نسطوری طبیب جرجیس بن بخت یشوع کو علاج کے لئے طلب کیا جند شاپور کی طب اور فلسفہ کی اکاڈیمی نوشیروان نے ۵۵۵ء میں قائم کی تھی طب یونانی تھی لیکن زبان تعلیمی ارامائی علاج کامیاب ثابت ہوا قدر شناس خلیفہ نے جرجیس کو طبیب دربار مقرر کیا۔ اس کی چھ سات پشتیں بغداد میں ڈھائی سو سال تک درباری طبیب کی خدمت پر فائز رہیں۔

عربوں کی فتوحات کے زمانہ میں یونانی حکمت اور فلسفہ شام میں بالخصوص حران کے عیسائیوں حران کے صابیوں اور انطاکیہ اور اسکندریہ کے قدیم مذاہب والے اقوام میں سرایت کر چکے تھے۔ مذہبی رنگ غالب تھا لیکن علم و حکمت کی بھی قدر تھی۔ عربوں کا ان ممالک سے جب تصادم ہوا تو مال غنیمت کے ساتھ قدیم یونانی علوم و حکمت کے خزانے بھی ان کے ہاتھ آئے پھر کیا تھا المنصور کے زمانہ ہی سے یونانی زبان سے سریانی (شامی) میں اور سریانی سے عربی میں اسکے ترجمے ہونے لگے۔ ابتداً یہ ترجمے کسی قدر ناقص تھے لیکن

علم کے پیاسے عربوں نے ان ہی کو پڑھ کر سمجھنا شروع کر دیا۔

حسن اتفاق سے (سنہ ۱۵۶ھ م سنہ ۷۷۳ء) میں ایک ہندوستانی سیاح بغداد میں سدھانتا (سند ہند) کا ایک نسخہ لایا جو ہندوؤں کے علم ہیئت کا خلاصہ تھا محمد بن ابراہیم الفزاری نے منصور کے حکم سے اس کا عربی میں ترجمہ کیا۔ محمد بن ابراہیم کو مسلمانوں کا سب سے پہلا منجم یا محقق ہیئت سمجھنا چاہیئے اس کی تحقیقات پر الخوارزمی نے (ف سنہ ۲۳۵ھ) اپنی شہرۂ آفاق زیج تیار کی اور یونانی اور ہندی ہیئتوں کو باہم دیگر منطبق کیا۔ فارسی ہیئت کی کتابوں کا عربی میں الفضل بن نوبخت نے (ف سنہ ۱۵ھ) جو ہارون الرشید کا مہتمم کتب خانہ تھا ترجمہ کیا۔

جو ہندوستانی سیاح سند ہند لایا تھا ایک ریاضی کی کتاب بھی لایا جس میں اعداد کی کتابت ہندی طریقہ پر سمجھائی گئی تھی۔ عربوں کا مروجہ طریقہ اگرچہ رومن طریقہ سے بہتر تھا لیکن صفر کی ایجاد سے محروم ہونے کی وجہ سے ہندی طریقہ کے برابر سودمند اور واضح نہ تھا اس لئے انہوں نے فوراً اس کو اختیار کر لیا اور اپنی حق پرستی سے اس طریقہ کتابت کو ہندی کے نام سے منسوب کیا پھر نویں صدی میں جب ہند و حساب دانوں نے اعشاریہ کا طریقہ رائج کیا تو عربوں نے اس کو بھی اس کے فواید کے مدنظر نہ صرف اختیار کر لیا بلکہ مشرق سے لے کر مغرب تک پھیلا دیا جو قوم علم کی ناشر ہوتی ہے اس کو بھی دنیا وہی رتبہ دیتی ہے جو موجد کے لئے مخصوص ہونا چاہیئے اسی وجہ سے اہل یورپ اس طریقہ حساب کو عربی کہتے ہیں۔

بغداد میں ایرانی علوم سے بھی استفادہ کیا گیا لیکن ان کا اثر ادب اور فنون لطیفہ پر زیادہ محسوس ہوا بہ نسبت عرب سائنس و فلسفہ کے اسی اثر کا نتیجہ تھا کہ نوشیرواں کے زمانہ میں شطرنج کے ساتھ سنسکرت کی جس کتاب کا پہلوی زبان میں خیر مقدم کیا گیا (یعنی حکیم بیدپائے کا افسانہ کلیلہ و دمنہ) اس کو ابن المقفع نے عربی جامہ پہنا کر اس قدر مشہور

کیا کہ وہ یورپ اور ایشیا کی تقریباً تمام شائستہ زبانوں میں ترجمہ ہو گئی چنانچہ تیرھویں صدی عیسوی میں قسطیلیہ (Castile) اور لیون کے بادشاہ الفونسو دانشمند کے لیے اس کا ہسپانی زبان میں ترجمہ ہوا اور چند ہی سال کے بعد لاطینی میں۔ لافونٹین معترف ہے کہ اس نے اپنے مشہور قصے اسی کے تتبع میں لکھے۔ یونان کی منطق اگرچہ عربوں کو پسند آئی لیکن یونانی ادب مثلاً تصانیف ہومر، سوفوکلیس وغیرہ کو مقبولیت حاصل نہ ہوئی۔ عربوں کو یونان کی حکمت، طب، ریاضیات اور ہئیت سے جو انس تھا اتنا کسی اور ملک کے کسی دوسرے فن سے نہ تھا چنانچہ چند ہی سال کے اندر حکمائے یونان کے ان مضامین کے شاہکار مع شرح و تعریف عربی زبان میں داخل ہو گئے۔

ابو یحییٰ ابن البطریق نے جالینوس (سنہ ۲ء) اور بقراط (سنہ ۳۶ قبل مسیح) کے اکثر تصانیف بطلیموس کی کوادریپارٹیٹم بطلیموس کی المجسطی اور اقلیدس کے عناصر کا ترجمہ کیا۔ ایک دوسرے مترجم شامی عیسائی یوحنا بن ماسویہ (ف سنہ ۸۵۵ء) جبرئیل بن بخت یشوع کے شاگرد اور حنین بن اسحٰق کے استاد نے چند طبی مخطوطات کے ترجمے کیے۔

جب مامون خلیفہ ہوا تو (سنہ ۸۳۰ء) میں بیت الحکمہ قائم کر کے ترجمہ و تالیف کے کام کو انتہائے کمال کو پہنچا دیا۔ اس کے عہد میں علم کی جو قدر تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ حنین بن اسحٰق جو ابتداً ایک غریب عبادی یعنی نسطوری عیسائی کا لڑکا تھا۔ جب موسیٰ بن شاکر کے علم دوست بیٹوں کے پاس یونانی و شامی زبانوں سے اساتذہ کی کتابوں کا ترجمہ کرنے پر مع اپنے ساتھیوں اور رشتہ داروں کے ملازم ہوا تو ماہانہ (۵۰۰) دینار تقریباً (۲۵۰) پونڈ مشاہرہ پاتا تھا۔ ابن خلکان نے اس بینظیر عالم کی کمائی ہوئی دولت اور خوشحالی کا جو ذکر اپنی مشہور کتاب وفیات الاعیان جلد اول میں کیا ہے پڑھنے کے قابل ہے کیوں نہ ہو شیخ المترجمین کو اس کی ہر ترجمہ

کی ہوئی کتاب کے معاوضہ میں (جب وہ مامون کے پاس اس کام پر مقرر ہوا تو) دربار شاہی سے کتاب کے برابر وزن کا سونا انعام ملتا تھا۔ علاوہ مترجم ہونے کے وہ خود بھی بڑا حاذق طبیب تھا۔ چنانچہ المتوکل نے (سنہ ۸۴۷ء ۔ سنہ ۸۶۱ء) بالآخر اس کو اپنا طبیب خاص مقرر کیا۔

ایک اور شیخ المترجمین ثابت بن قرہ (سنہ ۸۳۶ء ۔ سنہ ۹۰۱ء) حرّان کے صابئیوں میں سے تھا جو زمانہ قدیم سے ستارہ پرست چلے آرہے تھے اور ہیئت [illegible] فنی کے بالطبع دلدادہ تھے۔ ثابت اور اس کے ساتھیوں نے ارشمیدس (ف سنہ ۲۱۲ قبل مسیح) اور ابولونیس پرگائی (قریب سنہ ۲۶۲ قبل مسیح) کے ریاضی کے شاہکاروں کا ترجمہ کرڈالا اور اس سے پہلے جو ناقص ترجمے یونانی کتب ریاضی کے عربی زبان میں ہوئے تھے ان کی تصحیح کی۔ خلیفہ المعتضد نے (سنہ ۸۹۲ء ۔ سنہ ۹۰۲ء) ثابت کو اپنے زمرۂ مصاحبین و احباب میں داخل کیا۔ اس کے بعد اس کے بیٹے ابراہیم اور سنان اور پوتے ثابت اور ابراہیم اور پڑپوتا ابوالفرج (بحوالہ ابن ابی اصیبعہ و قفطی) اس ترجمہ و تالیف اور تحقیق و تجسس کے کاموں میں سرگرم عمل رہے اور بالآخر تمام دنیائے عرب میں مشہور ہوئے۔ ثابت کے کام شروع کرنے کے بعد سب سے بڑا صابئی سائنس داں ابوعبداللہ محمد بن جابر البتانی (مابین سنہ ۸۵۸ء و سنہ ۹۲۹ء) تھا جو مشرف بہ اسلام ہوا تھا وہ مترجم نہیں تھا بلکہ خود اپنی ذات سے مسائل ہیئت کی تحقیق کرتا تھا۔ بطلیموس کے مشاہدات کے ساتھ اپنے مشاہدات کا مقابلہ کیا تو اس کو آفتاب کے اوج کی حرکت کا پتہ چلا اور طریق شمس کے میل میں تبدیلی معلوم ہوئی۔ اس نے استقبال الاعتدالین کی صحیح ترقیمت دریافت کی اور علم المثلثات میں جیوب کا استعمال آغاز کیا۔ حرکات ثوابت پر اسی کی کتاب کے لاطینی ترجمے کا مطالعہ کرکے ہولیس نے چاند کی حرکت میں دہری تغیر محسوس کیا۔

اس سے پہلے حجاج بن یوسف بن مطر نے (۷۸۶ء اور ۸۳۳ء) کے درمیان اقلیدس کے عناصر اور بطلیموس کی المجسطی کا ترجمہ کیا تھا۔ چونکہ اس میں کچھ نقص رہ گئے تھے، ابو الوفا محمد ابوزجانی الحاسب (۹۴۰ء ۹۹۸ء) ان کی تصحیح کی۔ اس کی زیج الواضح اور کتاب الہندسہ بہت مشہور تھیں۔ ہیئت سے کہیں زیادہ اس نے ریاضی خصوصاً مثلثات میں تحقیقات کی ہیں۔ مماس۔ مماس تمام، قاطع، قاطع التمام کو زیادہ رواج دیا اور ان کے نئے ضابطے دریافت کئے۔ ریاضی کے مسلّم ماہروں کی اولین صف میں اس کا شمار ہوتا ہے۔

بعد کو آنے والے مترجموں میں بعلبک کا ایک عیسائی قسطا بن لوقا (۹۲۲ء) بھی تھا، اس کا ذکر ہے ابن الندیم کی فہرست میں اس کی خاص اپنی تصنیفات کی تعداد (۳۴) بتائی گئی ہے۔ تکریت کا مونوفائزائیٹ یحییٰ بن عدی (ال ۸۹۳ء ۹۷۴ء) جو بعد کو اپنی ملت کا آرچ بشپ بنا ایک مرتبہ ابن الندیم سے کہا کہ وہ بروے اوسط ایک شبانہ روز میں ایک سو صفحے نقل کرتا تھا۔ یحییٰ اور اس کے ساتھی زیادہ تر ارسطو کی فلسفیانہ تصانیف اور جدید افلاطونی خیالات کے حامل تھے۔ عرب علماء ابتداءً انہی تصانیف کے ذریعہ ان خیالات سے واقف ہوئے۔

اس دور کے مسلمان فیلسوفوں کا خیال تھا کہ ارسطو اور افلاطون کے اصولوں میں تضاد صرف ظاہری ہے۔ درحقیقت وہ ایک ہی ہیں۔ تصوف کے ذریعہ ان کو منطبق کیا جا سکتا ہے۔ اہل یورپ جب آگے چل کر ابن سینا اور ابن رشد کی استادانہ تحریرات سے (لاطینی ترجموں کے ذریعہ) واقف ہوئے تو اس کا اثر ان پر صدیوں تک دینی و دنیاوی مسائل میں جاری رہا اس وقت عوام تو عوام شارحین اور اس کے امرار اپنا نام تک مشکل لکھ سکتے تھے۔ ان کے لئے تحصیل علم و ہنر خواب سے بڑھ کر بے بنیاد تھی۔

عربوں نے یونان، ہند اور ایران کے مردہ علوم و حکمت کو اپنی زبان میں جگہ دیکر اپنی فتوحات کے ساتھ مشرق و مغرب شمال و جنوب میں پھیلا دیا۔ کچھ علوم تو مصر افریقہ اور مراکش سے اسپین ہوتے ہوئے کوہ پیرینیز کو پار کرکے جنوبی فرانس اور انگلستان میں داخل ہوئے اور کچھ اغلبیوں کی بازنطینیم پر بحری کامیابیوں کے ساتھ صقلیہ اور جنوبی اٹلی کی فتوحات کے ذریعہ اور پھر ایک سو اٹھانوے (۱۹۸) سال کی سیاسی حکومت کے مٹ جانے پر تمدنی تسلط کے ذریعہ عیسائی فرمانروا جرمن بادشاہوں کی مساعی سے الپس کے پہاڑوں کو عبور کرکے جرمنی ہالینڈ وغیرہ میں جلوہ گر ہوئے۔

اگر تمدن اور علم و حکمت کے ہر شعبہ کی اشاعت کا ذکر کیا جائے تو کئی دفاتر سیاہ کرنے پڑیں گے میں چوٹی کی چند باتیں مختصراً بیان کئے دیتا ہوں۔ بغداد میں یونانی طب کی سرایت کا ابھی ذکر ہو چکا ہے۔ تشریح (اناٹومی) کی ترقی کا واحد طریقہ نعشوں کے چیرنے پھاڑنے ہی سے ہو سکتا تھا ابتداً یہ عمل نہ تو عیسائی مذہب میں جائز سمجھا گیا اور نہ اسلام میں اس لئے یوحنا بن ماسویہ نے خلیفہ المعتصم کے پاس نوبیہ سے ۸۳۶ء میں جو بندر تحفۃً بھیجا گیا تھا اس کی نعش پر عمل جراحی کرکے چند ابتدائی باتیں معلوم کیں بعد کو بارھویں صدی میں عبداللطیف المصری کو جب ایک جگہ اتفاقاً انسانوں کی ہڈیوں کا ایک بڑا انبار دستیاب ہوا تو ان کو دفن کرنے سے پہلے اس طب کے شیدائی نے ہر ایک ہڈی کی تحقیق کی اور ان کی ساخت ترتیب وغیرہ سے متعلق متعدد نئی معلومات فراہم کئے تشریح ہوگئے چلکر سلرنو، بولونیا پیرس وغیرہ کی جامعات میں بہتر کام ہونے لگے لیکن سائنٹفک طب کا بیج یورپ میں مسلمانوں ہی نے بویا۔ امراض کی تفصیل ادویہ اور ان کے استعمال کے طریقے مفردات اور نباتات و معدنیات کے طبی خواص وغیرہ عربوں

ہی نے ڈچ یورپ کو سکھائے کانسٹانٹائین افریقی نے افریقہ میں عرب اساتذہ سے تعلیم پاکر سلرنو کے طبی مدرسہ کی بنیاد ڈالی وہاں ابن سینا اور ابو زکریا الرازی کی کتابوں کے لاطینی ترجمے نصاب تعلیم میں داخل تھے پھر مونٹ پلیئر پیرس، لیڈن آکسفورڈ وغیرہ میں یہ کتابیں رائج ہوئیں۔

خلفائے بنی عباسیہ نے طبیبوں کی جو قدر کی اس کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ جبرئیل بن بخت یشوع جو ہارون الرشید اور المامون کا درباری طبیب تھا اور براکمہ کا بھی علاج کرتا تھا جب مرا ہے تو بحوالہ القفطی آٹھ لاکھ درہم چھوڑا۔ بغداد میں مامون اور معتصم کے دور میں دواسازوں دوافروشوں اور طبیبوں کو بھی باضابطہ امتحان دے کے اجازے حاصل کرنا لازمی گردانا گیا تھا۔ المقتدر نے ۹۳۱ء میں سنان ابن ثابت بن قرہ کو اس امتحانوں کا ناظم مقرر کیا اور آٹھ سو آٹھ سے زیادہ امیدوار امتحان کے بعد طبیبی کے اہل قرار دئے گئے۔ سنان نے گشتی دواخانے بھی قائم کئے جو دوائیوں اور طبیبوں کے ساتھ جابجا گشت کرتے تھے حتیٰ کہ قیدخانوں کا بھی دورہ کرتے اور بیمار قیدیوں کا علاج کرتے تھے۔ سب سے پہلا بیمارستان ہارون الرشید نے بغداد میں قائم کیا۔ چند ہی سال بعد دنیائے اسلام میں (۳۴) ہسپتالیں تیار ہوگئیں۔ قاہرہ میں ابن طولون نے جو بیمارستان ۸۷۳ء میں قائم کیا تھا پندرھویں صدی تک برقرار رہا۔ گیارہویں صدی میں سفری دواخانے رائج ہوئے ہسپتالوں میں عورتوں کے وارڈ علیحدہ ہوا کرتے تھے ان کے خدام بھی عورتیں ہی ہوا کرتی تھیں ہسپتالوں کے ساتھ طبی درسگاہیں اور کتب خانے بھی ناموں تھے ان دنوں اہل یورپ متعدی بیماریوں سے نہ صرف بالکلیہ ناواقف تھے بلکہ جب کبھی کوئی ایسی بیماری میں مبتلا ہوتا تو دوا کے عوض مذہبی بزرگوں کے فرضی مزاروں سے نکالی ہوئی ہڈیوں کا صندل استعمال کیا جاتا تھا۔

دور تراجم کے بعد جو مسلمان طبیب علاج وتحقیق کے میدان میں کمال حاصل کئے ان میں علی بن سہل ربان الطبری مصنف فردوس الحکمت (ف ۸۵۰ء) ابوبکر محمد بن زکریا الرازی (ف ۸۶۵ء - سنہ ۹۲۳ء) ابن علی العباس المجوسی اور ابن سینا خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔ ابن سینا اور الرازی کی تصویریں جامعہ پیرس کے شعبہ طب کے بڑے ہال کو اب بھی زینت بخش رہی ہیں۔ علی بن سہل ربان الطبری ابتداً عیسائی تھا المتوکل کے دور خلافت میں مشرف باسلام ہوا اور خود خلیفہ کا معالج بنا۔ سنہ ۸۵۰ء میں یہ ضخیم کتاب تصنیف کی جس کا کچھ حصہ فلسفہ اور ہیئت سے بھی متعلق ہے اور یونانی اور ہندی ذرائع پر مبنی ہے۔

الرازی کا مقام پیدائش رے قریب طہران ہے۔ وہ علی الطبری کا شاگرد تھا۔ بعد کو بغداد کے سب سے بڑے بیمارستان کا صدر مقرر ہوا۔ جراحی میں سیٹون کا موجد تھا۔ فہرست میں اس کے ۱۱۳ بڑے تصانیف اور ۲۸ چھوٹے مذکور ہیں جن میں سے بارہ کیمیا سے متعلق ہیں۔ اس کی کتاب المنصوری کا (جو منصور بن اسحق السامانی کے نام سے معنون تھی) ترجمہ لاطینی زبان میں شہر میلان میں سنہ ۱۴۸۱ء اور سنہ ۱۴۸۹ء کے بین بین طبع ہوا۔ اس کے سب سے زیادہ قابل قدر رسالوں میں الجدری والحصبہ ہے جو چیچک اور گوبری پر سب سے پہلی اور صحیح طبی تحقیق ہے۔ ان امراض کے متعلق اس میں جو معلومات درج ہیں بیان کیا جاتا ہے کہ بیسویں صدی میں بھی مستند سمجھی جاتی ہیں۔ اس خصوص میں ولیم اے گرین ہل کا انگریزی ترجمہ (لندن سنہ ۱۸۴۸ء) موسوم بہ **Al-Razi, A Treatise on Small-pox and measles** مطالعہ کے قابل ہے۔ چارلس آنجو کے حکم سے سنہ ۱۲۷۹ء میں صقلیہ کے یہودی طبیب فرج بن سالم نے الرازی کی سب سے بڑی اور مشہور کتاب الحاوی کا لاطینی میں **Continens** کے نام سے ترجمہ کیا۔ اس کی پانچویں ایڈیشن وینس میں سنہ ۱۵۴۲ء میں طبع ہوئی۔

ابن علی العباس المجوسی (Haly Abbas) (ف ۹۹۴ء) نے بویہ سلطان عضدالدولہ کے لئے کتاب الملکی (Liber regius) تصنیف کی جو الحاوی سے مختصر تھی اور برسوں نصاب درس میں شریک رہی اور صرف ابن سینا کی شہرہ آفاق تصنیف قانون فی الطب کے شائع ہونے پر نصاب سے نکل گئی۔ کتاب الملکی میں سب سے پہلے شریانوں شعریوں کی ساخت اور ان کے فعل کا ذکر ہے اور ولادت کے متعلق صدیوں سے چلے آ رہے اس غلط خیال کی کہ بچہ خود بطن مادر سے باہر آتا ہے تردید کر کے بتایا گیا ہے کہ رحم مادر کے عضلات کا تناؤ اسکو باہر لاتا ہے۔

صدیوں تک سب سے زیادہ جو نام نہ صرف مشرق میں بلکہ مغرب کے ہر گوشہ میں مشہور چلا آیا وہ الرازی کے بعد شیخ الرئیس ابن سینا کا ہے (۹۸۰ء۔ ۱۰۳۷ء) چونکہ ابو علی الحسین ابن سینا کے حالات سے ہر فرد بشر واقف ہے میں صرف اتنا کہنا مناسب سمجھتا ہوں کہ یہ نام یورپ میں صدیوں احترام کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ پندرھویں صدی کے آخری تیس برسوں میں اس کی کتاب قانون کی پندرہ لاطینی ایڈیشن شائع ہوئیں اور ایک اڈیشن عبرانی میں۔ اس میں سل کے متعدی ہونے اور پانی کے ذریعہ امراض کے پھیلنے پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں ۷۶۰ ادویہ کی تفصیل درج ہے۔ وہ بارھویں صدی سے سترھویں صدی تک یورپ کے طبیبوں کی رہنما رہی۔ اور بقول ڈاکٹر اوسلر بہ نسبت کسی اور تصنیف کے زیادہ مدت تک طبی بائبل مانی گئی۔

It has remained a medical bible for a longer period than any other work

عراق اور مصر میں بدقسمتی سے امراض چشم بہ نسبت اور ممالک کے زیادہ ہوا کرتے تھے اور شاید اب بھی ہوتے ہیں۔ عرب طبیبوں کو خواہ مسلمان ہوں یا عیسائی ان امراض کی تشخیص اور علاج میں ید طولیٰ حاصل تھا۔ گیارھویں صدی کے نصف دور کا سب سے بڑھ کر مشہور کحال بغداد کا علی بن عیسیٰ تھا۔ قرون وسطیٰ کے (۲۰۲)

عربی تصانیف علاج چشم سے متعلق ہیں۔ علی کی کتاب تذکرۃ الکحالین اب تک مکمل حالت میں محفوظ ہے اس میں (۱۳۲) امراض چشم بیان کئے گئے ہیں بارھویں اور تیرھویں صدی میں شام اور مصر میں بھی اس شعبہ میں بہت قیمتی کام ہوا ہے ابو روح محمد بن منصور بن عبداللہ بن منصور الجرجانی الملقب بہ زرین دست نے سلجوقی سلطان ابوالفتح ملک شاہ بن محمد کے دربار میں ۵۰۰ھ میں نہایت مکمل کتاب نور العیون لکھی۔

فن بیطاری میں المعتضد کے داروغہ اصطبل یعقوب بن اخی حزام کی کتاب الفروسیہ وشیات الخیل قابل ذکر ہے۔

فلسفہ میں خالص عربی النسل ابو یوسف یعقوب ابن اسحٰق الکندی کا مرتبہ بہت بلند ہے یہ الکوفہ میں نویں صدی کے وسط میں پیدا ہوا اور بغداد میں بود و باش اختیار کی الکندی نہ صرف فلسفہ کا ماہر تھا بلکہ نجوم، کیمیا، علم المناظر اور موسیقی کا بھی استاد تھا۔ اس کی (۲۶۵) تصانیف میں سے اکثر مفقود ہو گئی ہیں۔ موسیقی میں ایقاع (Rhythm) کی اہمیت اسی نے پہلے ظاہر کی اور اس لحاظ سے موسیقی کی کمّی وکیفی تشریح مسلمانان مشرق میں یورپ کے عیسائیوں سے کئی سال پہلے وقوع میں آئی یہ واقعہ ہے کہ الکندی کی تصانیف (مثل متعدد دیگر عرب مصنفین کی تصانیف کے) لاطینی ترجموں میں بہ نسبت اصل عربی کے زیادہ دستیاب ہوتی ہیں یونانی فلسفہ کا انطباق اسلامی عقاید و تعلیم کے ساتھ الکندی نے شروع کیا الفارابی نے اس کو جاری رکھا اور ابن سینا نے اس کو مکمل کیا۔

محمد بن محمد ابن ترخان ابو نصر الفارابی ماوراءالنہر میں پیدا ہوا سیف الدولہ حمدانی کے دربار حلب میں عزت و سرفرازی حاصل کی اور ۹۵۰ء میں جب کہ وہ (۸۰) برس کا تھا وفات پائی اس کی مشہور تصانیف میں رسالہ فصوص الحکم رسالہ فی آراء اہل المدینۃ الفاضلہ اور السیاسۃ المدنیۃ داخل ہیں۔ آخر الذکر دو کتابوں میں الفارابی افلاطون

ری پبلک (Republic) کے زیر اثر بہترین شہر کے نظم و نسق کو مذہبی حکومت کے تحت جسم انسانی کے مشابہ قایم کرنا چاہا ہے اس فرضی شہر کا مقصود اولیں شہریوں کی خوشحالی بتائی گئی ہے اور اقتدار اعلی اخلاقی و ذہنی حیثیت سے کامل متصور ہے۔

الفارابی کے موسیقی کے کمالات شہرہ آفاق ہیں سیف الدولہ کے سارے دربار کو اگر ایک راگ سے ہنسا دیتا تھا تو دوسرے راگ سے رلاتا تھا۔ اور کبھی سو دیکھی یہ لاکر عرصہ تک حالت خواب میں رکھتا۔

ہیئت اور ریاضی میں المامون کے عہد کا ذکر کیا جا چکا ہے بغداد کے باب الشماسیہ کے قریب جو رصدگاہ مسلم یہودی سند ابن علی اور یحیی بن ابی منصور (ف ۸۳۰ء) کی نگرانی میں قائم تھی اس میں ہیئتی مشاہدے خود عربوں کے بنائے ہوئے آلات سے کئے جاتے تھے انسائیکلو پیڈیا آف اسلام میں سی۔ اے نلینو کے مضمون ہیئت اور بیز صاعد کی طبقات کے مطالعہ سے ان امور کے متعلق تفصیلی معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔ صرف اتنا کہدینا کافی سمجھتا ہوں کہ ابراہیم الفزاری نے (ف ۰۰۰ء) سب سے پہلے اصطرلاب بنائی اور علی بن عیسی الاصطرلابی نے بغداد و دمشق میں ۸۳۰ء سے قبل اس آلہ پر کتاب تصنیف کی۔

المامون کے مہندسوں اور منجموں نے زمین کے درجہ عرض بلد کی دو پیمائشیں کیں ایک دریائے فرات کے شمال میدان سنجار میں اور دوسری پلمائرا میں۔ ان پیمائشوں کی نسبت بعض مغربی مورخوں نے جو نتائج شائع کئے ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ یہ فاصلہ ۵۶⅔ میل ہے اور اس کو بہت صحیح اور حقیقی طول سے صرف ۲۸۷۷ فٹ زیادہ قرار دیا جاتا ہے لیکن یہ اعداد بجائے خود غلط ہیں اس لئے کہ اصل طول (۶۹) میل کے قریب ہے۔ جیسا کہ میں نے عبد الرحمن الخازنی کی تصنیف میزان الحکمۃ کے تبصرہ میں بیان کیا ہے عربوں کی پیمائش کا نتیجہ دو میل تقریباً (۶۹) میل ہی ہے چونکہ

یہ پیمائشیں ذرعوں میں کی گئی تھیں اور کئی قسم کے ذرع مروج تھے اس لئے ان کا صحیح اندازہ زمانہ حال کی اکائی طول (فٹ یا سنٹی میٹر) کے لحاظ سے آسان نہیں ہے

الخوارزمی کی زیج پر مسلمہ المجریطی (ف ۱۰۰۷ء) نے نظر ثانی کر کے سابقہ تمام جداول کو منسوخ کر دیا۔ اس زیج کا اڈیلارڈ آف باتھ نے لاطینی میں ۱۱۲۶ء میں ترجمہ کیا اور اس کے جداول چین سے لے کر یورپ و افریقہ کے مغربی ساحل تک استعمال ہونے لگے۔

اسی دور کا ایک دوسرا ممتاز اور سربر آوردہ ہیئت داں ماوراء النہر کا ابوالعباس احمد الفرغانی تھا جس نے المتوکل کے لئے فسطاط میں ایک نیل پیما تیار کیا۔ اس کی بے نظیر کتاب المدخل الی ہیئۃ الافلاک کا اشبیلیہ کے یوحنا اور جیرارڈ کریمونائی نے ۱۱۳۵ء میں لاطینی میں ترجمہ کیا اور یہودیوں نے اپنی عبرانی زبان میں زمانہ دراز تک یہ کتاب یورپ کے نصاب تعلیم میں رہی اسی کے مطالعے سے (Dante) ڈانٹے نے اپنی تصنیف ڈیوائین کومیڈی کے ہیئتی واقعات معلوم کئے خوش قسمتی سے عربی میں الفرغانی کی کتاب کے چند مخطوطات موجود ہیں۔

بویہ سلطان شرف الدولہ (ف ۹۸۲ء) نے اپنے بغداد کے قصر میں ایک رصدگاہ قائم کی جہاں عبدالرحمن الصوفی، احمد الصاغانی اور ابوالوفا برسر عمل تھے الصوفی کی کتاب الکواکب الثابتہ المصور اب بھی بڑی کار آمد ہے اس میں سب سے پہلے اندرومیدا کے کوکبی سحاب کا داخلہ موجود ہے بڑی تحقیق سے اس زمانہ میں ستاروں کی جو قدریں تھیں قلمبند کی گئی ہیں اور ان کے مقامات بھی بتائے گئے ہیں چونکہ اکثر ستارے حالیہ تحقیق اور طویل مشاہدوں کی مدد سے متغیر پائے گئے ہیں اس زمانہ کی قدروں کا حالیہ قدروں سے مقابلہ بہت دلچسپ اور نتیجہ خیز ثابت ہوا ہے گنگور ہوگا۔ مشرق میں اس بلند پایہ کے صرف دو اور فلکیات کے مشاہد اور عملی ہیئت داں

گزرے ہیں ایک علی بن یونس (ف سنہ ۱۰۰۹ء) اور دوسرا الغ بیگ سمرقندی سنہ ۱۳۹۳ء ۔ ۱۴۴۹ء
ایک دوسرے بویہ سلطان رکن الدولہ (سنہ ۹۳۲ء ۔ سنہ ۹۷۶ء) کے دربار سے ابو جعفر
الخازن الخراسانی نے میل طریق الشمس کی از سر نو تعیین کی اور ارشمیدس کے ایک پرانے
سوال کا کعبی مساوات کے ذریعہ حل شائع کیا۔

بغداد میں ایک اور رصدگاہ تھی جو موسیٰ بن شاکر (سنہ ۸۰۳ء ۔ سنہ ۸۷۳ء) کے تین بیٹوں
کے مکان میں قائم تھی ۔ شیراز، سمرقند اور نیشاپور میں بھی منجم مشاہدات فلکی میں مسلسل مشغول
رہا کرتے تھے ۔ الرقہ کے عبد اللہ محمد بن جابر البتانی کا اس سے پہلے ذکر آ چکا ہے ۔

ابو ریحان محمد بن احمد البیرونی (سنہ ۹۷۳ء ۔ سنہ ۱۰۴۸ء) کی عمر کا بڑا حصہ افغانستان میں غزنوی
سلاطین کے ساتھ گزرا ہے اس کی کتاب القانون المسعودی فی الہیئۃ والنجوم اس وقت کی
ہیئت کے سارے شعبوں پر حاوی ہے ۔ البیرونی جیسا صحیح مشاہد بیسویں صدی میں بھی بمشکل
ملیگا ۔ حیدرآباد اکاڈیمی کی اشاعتوں میں میں نے اس کے بعض مشاہدات (اور ان کی تعبیر)
کو زمانہ حال کی علمی دنیا سے روشناس کرایا ہے ۔ البیرونی حساب میں بھی اتنا ہی ماہر تھا اس
کی ایک دوسری تصنیف الآثار الباقیہ من القرون الخالیہ کے مدیر ایڈورڈ زاخاو
(Eduard Sachau) پروفیسر جامعہ برلن نے اس کی بڑی تعریف کی ہے اور
اس زمانے کے عرب اور دیگر مسلمان محققین کے کارناموں کو پیش نظر رکھ کر لکھا ہے کہ اگر
چوتھی صدی ہجری میں الاشعری اور الغزالی کا مذہبی اور صوفیانہ رنگ مسلمانوں پر نہ چھا جاتا تو
عرب قوم گلیلیو، کپلر اور نیوٹن جیسے بلند پایہ محقق پیدا کرنے والی قوم ہوتی ۔ البیرونی کی ایک
اور تصنیف التفہیم لاوائل صناعۃ التنجیم جس میں سوال و جواب کی شکل میں ہندسہ ہیئت اور
نجوم کے مسائل سمجھائے گئے ہیں پڑھنے کے قابل ہے اس کے علاوہ وہ بڑا ہی تجربہ کا
بھی ماہر تھا ۔ ماسکونیات میں اس کے تجربے باوجود اس زمانہ کے نامکمل حالات کے طبیعیات
کے آجکل کے تعلیم پانے والوں کے تجربوں سے بہتر نتائج کے حامل ثابت ہوئے ہیں البتہ

سنسکرت سے بھی بخوبی واقف تھا اور ہندی طریقہ حساب کا بڑا حامی تھا۔

سلجوق سلطان جلال الدین ملک شاہ کی رصدگاہ واقع رے یا نیشاپور میں عمر الخیامی (شنہ ا۔ سنہ ۱۱۲۳) کے کارنامے آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں۔ اس زمانہ کی آرام طلب دنیا خیام کی صرف رندانہ شاعری سے واقف ہے۔ اس کی تاریخ الجلالی کی خوبیاں جو ہر پانچ ہزار سال میں صرف ایک دن کی غلطی پیدا ہوتی ہے اور جبر و مقابلہ کی کتاب جس میں ثنائی سہ ابعاد کا جبری و ترسیمی حل معہ ترتیب و تحلیل مساوات کبھی سمجھا گیا ہے ایشیا و یورپ کے بہت کم لوگوں کو معلوم ہے۔

ہلاکو نے بغداد کو تاراج کر کے دوسرے ہی سال ۱۲۵۹ء میں بمقام مراغہ بجھے ہوئے علمی چراغ کو پھر سے روشن کیا۔ نصیر الدین طوسی کو اس رصدگاہ کا ناظم بنایا۔ یہ خداداد ذہانت کا مہندس زیج ایلخانی کا مولف تھا۔ اس نے اقلیدس کی تعریفات و اصول موضوعہ پر جو تنقید کی ہے بحوالہ ایک مستند عصر جدید کے ریاضی داں کے نان یوکلیڈین جیومٹری کا سنگ بنیاد ہے۔ نصیر الدین کی تصنیفات متعدد ہیں۔ ان میں سے صرف ایک شکل القطاع کا اس وقت ذکر کئے دیتا ہوں جو مینے لاوس کے مسئلہ سے متعلق ہے۔ اس کے لاطینی ترجمہ (Figura cata) سے علم المثلثات اور موڈرن جیومٹری کے بہت سے شایق پیدا ہوئے۔ اس کی دوسری مشہور تصانیف میں کتاب المتوسطات بین الہندسہ والہیہ، نزہت الناظر التذکرہ فی علم الہیہ وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے ساتھ قطب الدین شیرازی اور کمال الدین فارسی (مولف تنقیح المناظر) شریک کار تھے آخر الذکر نے قوس قزح کی جو ہندسی توجیہہ کی ہے وہی ہے جو سولھویں صدی عیسوی میں ڈیکارٹس نے شائع کی

ریاضی اور حساب کی تعمیر و ترقی میں محمد بن موسی الخوارزمی (شنہ۔ سنہ ۸۵۰ء) کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کو الجبر و المقابلہ کا موجد سمجھنا چاہیئے اس کی تصنیفات سے نہ صرف عمر الخیامی نے بلکہ پیزا کے لیونارڈو فیبوناچی (بعد سنہ ۱۲۰۲ء) اور فلارنس کے ماسٹر

جیکب نے دسشلا) بہت فائدہ اٹھایا۔

کیمیا میں جابر بن حیان اور دیگر عرب محققین کی تصنیفات چند ہی سال قبل بڑی وقعت کی نظر سے دیکھی جاتی تھیں موم یار ڈبر تھیلو جیسے نقادوں نے مان لیا تھا کہ گندھک شورے اور نمک کے تر شوں کی تیاری اور ان کے خواص و مرکبات عربوں کو بخوبی معلوم تھے اور انہی کی تحقیقات کے نتائج تھے لیکن جدید محققین مثلاً یو یوس رُسکا وغیرہ نے گیبر (Geber) کے نام سے منسوب لاطینی تصانیف کو پڑھ کر شبہ ظاہر کیا ہے کہ آیا جابر بن حیان نام کا فی الحقیقت کوئی شخص بھی کبھی موجود تھا۔ افسوس ہے کہ اس بحث کا ہنوز تصفیہ نہیں کیا گیا۔ باوجود ان موشگافیوں شبہات و توہمات کے بلاخوف تردید یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عربوں نے کیمیا کے بنیادی اصول یعنی تجربی تحقیقات اور ان کے مختلف ذرائع مثلاً تحلیل، کشید قلماو، کلسا و تبخیر تکلیس و ترسیب وغیرہ کی کامل توضیح کی اور متعدد نئے مرکبات خالص حالت میں تیار کئے گئے اور ان کے صحیح خواص بھی دریافت کئے۔

حیوانیات و نباتیات سے بھی عربوں کو لگاؤ تھا۔ نویں صدی کے عطارد بن محمد الحاسب (یا الکاتب) کی کتاب منافع الاحجار سب سے پرانی موجود ہے لیکن سب سے مشہور شہاب الدین التیفاشی کی ازہار الافکار فی جواہر الاحجار ہے اس میں (۲۴) قیمتی پتھروں کے محل وقوع جغرافی حالات، صفائی، قیمت، طبی و دیگر حقیقی و خیالی اثرات بیان کئے گئے ہیں۔ بلینوس اور ارسطو کے نام نہاد رسالوں کے سوا صرف عرب مصنفین ہی کے حوالے درج ہیں۔ البیرونی نے سچے اور جھوٹے پتھروں میں امتیاز کرنے کے لئے کثافت اضافی کے طریقہ پر بہت زور دیا ہے اور خود (۱۸) فلزات اور معدنیوں کی کثافتیں تعیین کیں۔ واضح ہو کہ موجودہ زمانے میں بھی یہ طریقہ بہت معتبر مانا جاتا ہے۔

جغرافیہ پر بھی عربوں نے بہت کام کیا ہے۔ حج بیت اللہ کے شوق، سمت کعبہ کی صحیح تعیین کی ضرورت اور سیر و سیاحت و تجارت کے مشغلوں سے عربوں کی جغرافی معلومات بہت وسیع ہو گئی تھیں۔ متعدد شہروں کے عرض بلد اور طول بلد انہوں نے دریافت کئے۔ ساتویں اور نویں صدی میں مسلمان تجار ایک طرف مشرق میں بری اور بحری راہوں سے چین پہنچے تو دوسری طرف جنوب میں زنجبار اور مدغاسکر کے جنوبی سواحل کا پتہ چلایا۔ مغرب میں بحر ظلمات کے کناروں تک جا پہنچے اور شمال میں روس کے اندر تک سرایت کر گئے۔ سیراف کے سلیمان التاجر کی مشرق بعید کی سیاحتوں کا حال ایک گمنام مصنف نے ۸۵۱ء میں لکھا یہ پہلی کتاب ہے جس سے ہند کے سواحل کی نسبت عربوں کی معلومات کا پتہ چلتا ہے۔ سلیمان ہی کے بیان سے معلوم ہوا ہے کہ چین میں زمانہ قدیم سے نشان ابہام کا طریقہ شناخت مروج ہے۔ روس کے متعلق سب سے پہلا قابل اعتماد بیان احمد بن فضلان ابن حماد نے شائع کیا جو ۹۲۱ء میں المقتدر کی طرف سے بلغاریوں کے پادشاہ کے پاس دریائے والگا کے کنارے بھیجا گیا تھا یاقوت کے شاہکار یعنی معجم البلدان میں یہ تمام واقعات درج ہیں اور زکی ولیدی کی تلاش سے حال میں اس سفرنامہ بلغاریہ کا مکمل نسخہ بھی کتب خانہ مشہد میں دستیاب ہو چکا ہے المسعودی مسلمان تاجروں کا ذکر کرتا ہے جو بوہیمیا میں بیوپار کیا کرتے تھے۔

بطلیموس کے جغرافیہ کا راست یونانی سے یا بتوسط سریانی عربی زبان میں یعقوب بن اسحق کندی نے ۸۷۴ء سے پہلے اور پھر ثابت بن قرہ نے ترجمہ کیا۔ الخوارزمی نے اپنی کتاب صورت الارض کے ساتھ زمین کا ایک نقشہ بھی بحکم المامون ۶۹ دوسرے علماء کے ساتھ ملکر شائع کیا۔ یہ کتاب بحوالہ ابوالفدا چودھویں صدی تک مستند مانی گئی بطلیموس کی متابعت میں مسلم جغرافیہ نویس طول بلد کا شمار جزائر کناری میں سے گزرنے والے نصف النہار سے کیا کرتے تھے۔

ابن خرداذبہ (فوت ۹۱۲ء) ناظم شعبہ معلومات عامہ نے سلسلۂ رسائل مسالک وممالک کی پہلی ایڈیشن (۸۴۶ء کے قرب وجوار میں) شائع کی اس سے ابن الفقیہ ابن حوقل المقدسی وغیرہ نے بہت کام لیا۔ ۸۹۱ء میں ابن واضح الیعقوبی نے اپنی کتاب البلدان میں معمولی جغرافی معلومات کے ساتھ معاشی معلومات کا اضافہ کیا قدامہ جو عیسائی پیدا ہوا مگر بعد کو مشرف باسلام ہوا بغداد میں ۹۲۸ء کے بعد مالگزاری کا محاسب تھا اور اپنی کتاب الخراج میں خلافت بنی عباسیہ کے صوبجات کی تقسیم، سالانہ آمدنی اور نظام رسل ورسائل پر بحث کی ہے اس نوع کی جغرافی کتابوں میں ابن رستا کی الاعلاق النفیسہ (۹۰۳ء) اور ابن الفقیہ الہمدانی کی کتاب البلدان بھی قابل ذکر ہیں۔ الاصطخری (۹۵۰ء) کی مسالک والممالک کے جغرافیہ میں مختلف ملکوں کے نقشے مختلف رنگوں میں دئے گئے ہیں۔ مسعودی کے بعد وہ دوسرا مصنف ہے جو سجستان کی ہوا چکیوں کا ذکر کرتا ہے۔ اس کے کہنے پر ابن حوقل (۹۴۳ء ۹۶۷ء) نے جو اسپین تک سفر کیا تھا اس کی کتاب اور نقشوں کی نظر ثانی کی۔ المقدسی کی کتاب احسن التقاسیم فی معرفت الاقالیم بڑی دلچسپ بیان کیجاتی ہے المقدسی تمام ممالک اسلام میں باستثناء اسپین، سجستان و ہند بیس سال تک گھومتا پھرا اور اس کتاب میں اپنے سفر کے واقعات نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ بیان کئے۔

اس دور کا یمن کا جغرافیہ داں اور آثار قدیمہ کا تذکرہ نویس الحسن بن احمد الہمدانی جو صنعا کے محبس میں ۹۴۵ء میں انتقال کیا اپنی تصنیفات الاکلیل اور صفت جزیرۃ العرب کی وجہ سے قابل ذکر ہے اسی دور میں سیاح الارض المسعودی نے بھی نشو ونما پایا مگر اس کا تذکرہ مورخوں کی فہرست میں زیادہ موزوں ہے۔

بنی عباسیہ کی خلافت کے آخری زمانہ میں یاقوت بن عبداللہ الحموی ۱۱۷۹ء ۱۲۲۹ء مشرقی مسلمانوں میں سب سے بڑا جغرافیہ نویس تھا۔ اس کی کتاب معجم البلدان

کو ایف وسٹنفلڈ نے چھ جلدوں میں مقام لائپسک اڈیٹ کیا ہے۔ کمسنی میں اس کے حمار کے ایک تاجر نے خرید کر تعلیم و تربیت دی اور بعد کو اپنا سفری منشی بنا کر آزاد کر دیا۔ یاقوت جا بجا پھر کر مخطوطات نقل کرتا اور بیچتا تھا۔ سنہ ۱۲۱۹ء میں تاتاری مغلوں نے خوارزم کو تاراج کیا تو بقول اسی کے اس کو مادر زاد جان بچا کر بھاگنا پڑا۔ اس کے شاہکار معجم البلدان کا پہلا مسودہ موصل میں سنہ ۱۲۲۴ء میں لکھا گیا اور حلب میں جہاں وہ فوت ہوا سنہ ۱۲۲۸ء میں مکمل ہوا۔ یہ انسائیکلوپیڈیا نہ صرف اس زمانہ کی جغرافی معلومات کا معدن ہے بلکہ تاریخ اقوام و بنی نوع انسان اور حیوانیات و نباتیات کی گرانقدر معلومات سے مملو ہے۔ یاقوت کی دوسری تصنیف معجم الادبا بھی اسی پایہ کی کتاب ہے۔

یہاں ابومعشر بغدادی (لاطینی Albumasar) ف سنہ ۸۸۶ء کے ہیئتی جغرافیہ کا ذکر بھی ضروری ہے جس میں سمندروں کے مد و جزر کا تقریباً صحیح نظریہ یعنی شمس و قمر کا سمندر کے پانی پر اثر تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ افسوس ہے کہ کیپلر جیسے محقق نے ابو معشر کے اس نظریہ کو نجوم کی من گھڑت تصور کر کے ماننے سے انکار کیا۔ اگر عربوں کی جغرافی تحقیقات مثل ان کے فلکی مشاہدات کے یورپ میں بروقت اشاعت پاتی تو اہل یورپ قرون وسطی کی تاریکیوں میں صدیوں تک نہ بھٹکتے۔

تاریخ نویسی میں مسلمانوں کو کمال حاصل تھا۔ محمد بن اسحق (ف قریب سنہ ۷۶۸ء بمقام بغداد) کی تاریخ حضرت رسول اللہ صلعم جو ہم تک ابن ہشام (ف سنہ ۸۳۴ء بمقام قاہرہ) کی تصنیف کے ذریعہ پہنچی ہے موسی ابن عقبہ (ف ۷۵۸ء) الواقدی (ف ۸۲۳ء) کی کتاب المغازی اور ابن سعد (ف سنہ ۸۴۵ء) کے طبقات عبد الحکم (ف سنہ ۸۷۱ء) کی فتوح مصر و اخبارہا۔ احمد بن یحییٰ البلاذری (ف سنہ ۸۹۲ء) مصنف فتوح البلدان و

انساب الاشراف، ابن مقفع (ف ۷۵۷ء) کے سیر ملوک العجم، ابن قتیبہ (محمد بن مسلم الدینوری) (ف ۸۸۹ء) کی کتاب المعارف، احمد بن داود الدینوری (ف ۸۹۵ء) کے اخبار الطوال، حمزہ الاصفہانی (ف قریب سنہ ۹۶۱ء) اور ابن واضح الیعقوبی کی تاریخوں، مسکویہ کی تاریخ، اختتام خلافت بغداد، ابو جعفر محمد بن جریر الطبری (۸۳۸ء۔ سنہ ۹۲۳ء) کے اخبار الرسل والملوک، عز الدین ابن الاثیر مصنف الکامل فی التاریخ (سنہ ۱۱۶۰ء۔ سنہ ۱۲۳۴ء) ابو الفدا (سنہ ۱۲۷۳ء۔ ۱۳۳۱ء) اور الذہبی (سنہ ۱۲۷۴ء۔ ۱۳۴۸ء) مصنف دول الاسلام کی تصنیفات سے کون شخص واقف نہیں۔ اس لئے ان پر مزید وقت صرف کرنے کی ضرورت نہیں۔ صرف اس پر اکتفا کیا جاتا ہے کہ الطبری نے اپنی معلومات فراہم کرنے کے لئے ایران عراق شام اور مصر کا سفر کیا۔ عام طور پر یہ الایا توت مشہور ہے کہ اس نے (۴۰) سال تک روزانہ (۴۰) ورق لکھے۔

ابو الحسن علی المسعودی نے تاریخ نویسی کے قدیم طریقہ سنہ واری اور واقعہ نگاری کو چھوڑ کر تنقیدی و سلسلہ واری طریقہ کو رواج دیا جس کو بعد میں تمام دنیا نے اختیار کر لیا ابن خلدون نے بھی اسی طریقہ کی تقلید کی۔ المسعودی کی تیس جلدوں والی تصنیف کا ایک خلاصہ موسوم بہ مروج الذہب و معادن الجواہر جو تاریخی واقعات کو سنہ ۳۳۶ھ م سنہ ۹۴۷ء تک پہنچاتا ہے ہم تک آیا ہے۔ مسعودی نے فسطاط میں سنہ ۹۵۶ء میں وفات پائی۔ مرنے سے پہلے اپنی ایک دوسری تصنیف (التنبیہ و الاشراف) میں معدنیات سے نباتات پھر حیوانات اور بالآخر انسان کے ارتقائی طریقہ پر عالم وجود میں رونما ہونے کا فلسفہ شائع کیا ہے۔

بنی عباسیہ کے علمی آخری دور ہی سے شمس الدین احمد بن محمد بن خلکان (ف سنہ ۱۲۸۲ء) شام کے مشہور قاضی مصنف وفیات الاعیان و انباء ابناء الزمان کا تعلق ہے اس کتاب میں (۸۶۵) سر برآوردہ تاریخی مسلمانوں کے سوانح حیات نہایت صحت کے ساتھ دلچسپ انداز میں لکھے گئے ہیں۔ بقول پروفیسر نکلسن سیر پر اس سے بہتر کتاب

اب تک نہیں لکھی گئی۔

اب، فقہ و حدیث کے مصنفین کا اگر ذکر کیا جائے تو یہ تقریر کئی دن تک جاری رہے گی ہمارا اصل مقصد عربوں کے حکمیاتی کارناموں کی توضیح اور دنیا و بالخصوص اہل یورپ پر ان کے احسانات کا اظہار ہے۔ اسی لئے فن تعمیر (شاہی قصور، مساجد وغیرہ) کا حال بھی نظر انداز کیا جاتا ہے اگرچہ بعض کلیسائیں بھی ان کے مساجد سے بہت کچھ مستعار لے کے بنی ہیں (مثلاً صقلیہ کے راجر دوم کے عہد میں بنائے ہوئے عیسائی معابد) عربوں کی نقش نگاری۔ جلد سازی۔ رنگ آمیزی اور دیگر فنون لطیفہ کے اثرات کا اعتراف عصر جدید کے مغربی محقق فراخدلی سے کرنے لگے ہیں۔

یورپ کا فن موسیقی عرب حکماء ہی کی بدولت سائنس کا معیار حاصل کر سکا جیساکہ لیگاسی آف اسلام (Legacy of Islam) کے باب موسیقی میں تھامس آرنولڈ اور الفریڈ گیوم (Alfred Guillaume) نے آکسفرڈ سے ۱۹۳۱ء میں تسلیم کیا ہے۔ اس خصوص میں الکندی اور الفارابی کی کتابیں خاص طور پر مطالعہ کی جاذب ہیں آخرالذکر کی کتاب الموسیقی الکبیر اور احصار العلوم کا اثر مشرق اور مغرب پر مسلمہ ہے۔ العود جس میں فارابی کو کمال حاصل تھا۔ انگریزی زبان میں بگڑ کر (Lute) بنا ہے۔

جیساکہ اس طویل تقریر سے ظاہر ہوا ہوگا ازمنہ وسطی میں علم و حکمت، تہذیب و تمدن کے علمبردار عرب یا عربی بولنے والے ہی تھے۔ دنیا کی بہترین اور اہم ترین کتابیں اسی زبان میں لکھی جاتی تھیں۔ اسی زبان میں دنیا علوم و فنون سیکھتی تھی اور اسی میں تحقیق و ترقی کے کام انجام پاتے تھے اسی کی اصطلاحیں لاطینی اور دیگر یورپین زبانوں میں ترجمہ ہو کر بعد کو آنیوالی نسلوں کے پاس اصل متصور ہونے لگیں۔ جارج سارٹن نے جو ہماری اس حیدرآباد اکاڈیمی کی علمی خدمات کے اعتراف میں رطب اللسان ہے اپنی عالمانہ تصنیف تاریخ و فلسفہ سائنس میں لکھا ہے کہ سنہ ۷۵۰ء سے سنہ ۱۱۰۰ء تک

عرب یا مسلمان ہی علم و حکمت کے مالک تھے۔ گیارہویں صدی سے ان کی رفتار سست ہونے لگی۔ لیکن بریں ہمہ یورپ کی قومیں صرف اسی وقت ان کے برابر ہوئیں جب بارہویں صدی میں ان کے تصانیف عربی سے لاطینی اور عبرانی زبانوں میں پھر یورپ کی دیسی زبانوں میں ترجمہ ہوئیں۔ تیرھویں صدی سے عیسائی اقوام کا پلہ بھاری ہونے لگا اگرچہ اب بھی چند عرب حکماء نے اپنی سابقہ عظمت کو ہاتھ سے جانے نہ دیا مثلاً ابو علی الحسن بن علی ابن عمر المراکشی (قریب سنہ ۱۲۶۲ء) مصنف جامع المبادی والغایات مراکش کا مشہور مہندس و منجم وغیرہ۔ پندرھویں صدی سے نہ تو ان کے پاس حکومت رہی اور نہ علم و حکمت کی ملکیت۔ اس عرض مدت کو سارٹان نے پچاس پچاس سال کے ادوار میں تقسیم کرکے ان ادوار کو ایک یا ایک سے زائد سربرآوردہ حکیم کے نام سے منسوب کیا ہے۔

آٹھویں صدی کا دوسرا نصف دورِ جابر ابن حیان۔ نویں صدی کا پہلا نصف۔ دورِ الخوارزمی

نویں . . . . ابو محمد بن زکریا الرازی۔ دسویں . . . . المسعودی

دسویں . . . . ابو الوفا گیارہویں . . . . البیرونی

گیارھویں . . . . عمر الخیامی بارھویں . . . . ولیم آف کونشے
ابراہام بن ازرا
ابن زہر

بارھویں . . . . جیرارڈ کریمونائی تیرھویں . . . . رابرٹ آف گروسیٹ
ابن رشد ابن البیطار
میمونیڈیز جیکب اناٹول

تیرھویں . . . . روجر بیکن
جیکب بن ماہر ابن تبّون

.... قطب الدین شیرازی

بارھویں صدی سے تین تین حکیموں کے نام لکھے گئے ہیں جن میں صرف ایک ایک مسلمان ہیں۔

علی الخصوص دورِ مسعودی کے متعلق سارٹان رطب اللسان ہے وہ لکھتا ہے:۔

اس دور میں دنیا کے اہم کاروبار مسلمان ہی انجام دیتے تھے۔ سب سے بڑا فلسفی الفارابی مسلمان تھا۔ سب سے بڑے ریاضی کے ماہر ابو کامل شجاع بن اسلم اور ابراہیم بن سنان مسلمان تھے۔ سب سے بڑا جغرافیہ نویس اور عالم متبحر المسعودی مسلمان تھا سب سے جید مورخ الطبری بھی مسلمان تھا۔ یہ سچ ہے کہ سب سے فاضل طبیب اسحٰق اسرائیلی مسلمان نہ تھا لیکن عربی بولنے اور لکھنے والا یہودی تھا۔ واضح ہو کہ اس زمانہ کے یہودی اپنی مذہبی زبان کی بہ نسبت عربی بہت زیادہ اور بہتر جانتے تھے۔ بہت کم لوگ اس راز سے واقف ہیں کہ اسپین کے تعلیم یافتہ یہودیوں نے عبرانی زبان کو علم و نکات کا حامل عربی قواعد و ضوابط ہی کی مدد سے بنایا!

عبرانی قواعد صرف و نحو نہ صرف مسلم اسپین میں مدوّن ہوئے بلکہ عربی قواعد ہی پر مبنی ہیں۔ ان کی اصطلاحیں عربی اصطلاحوں کے ترجمے ہیں۔ عبرانی صرف و نحو کا مرتب و مدوّن ابو زکریا عیسیٰ بن داؤد قرطبہ کا یہودی تھا جو گیارھویں صدی کے اوائل میں فوت ہوا۔ اسی طرح جنوبی مغربی یورپ کی دیسی زبانوں میں سوقیانہ شعر و سخن کا رواج عربوں کے موشح و زجل ہی کی تقلید میں ہوا (Don Quixote) ڈون کیشوت کا مزاحیہ افسانہ اس طرز کے بعض عربی قصوں کی ہسپانوی نقل ہے اس کا مصنف سروینٹیز کچھ مدت الجزائر میں محبوس تھا اور وہاں اس کو ان کے دیکھنے اور سننے کا موقعہ ملا تھا۔

عربی الفاظ نہ صرف فارسی، اردو اور دیگر ایشیائی زبانوں میں سرایت کر گئے ہیں بلکہ یورپ کی لاطینی اور دیسی زبانوں میں بھی سینکڑوں کی تعداد میں داخل ہو گئے ہیں

طب اور ہئیت کی اصطلاحوں میں یہ الفاظ بہت زیادہ پائے جاتے ہیں جب تک دوربین کی قوت کم تھی اور ستاروں کی تعداد نامتناہی تک نہ پہنچ گئی تھی ان میں سے تیسری سے زائد قدر کے ستارے بھی اپنے عربی ناموں ہی سے مشہور تھے۔ اب صُوَر سماوی کے کو الف صورت اور حروف تہجی یا عدد کے حوالے سے نامزد ہوتے ہیں۔ لیکن اب بھی پہلی اور دوسری بلکہ بعض تیسری قدر کے ستارے اپنے عربی ناموں ہی سے مشہور ہیں اگرچہ افسوس ہے کہ زبان نہ جاننے کی وجہ سے اہل یورپ و امریکہ ان میں سے اکثر الفاظ کو بگاڑ کر بلکہ لغو اور مہمل بنا کر استعمال کرتے ہیں۔

آٹھویں صدی میں مسلمانوں نے چینیوں سے سیکھ کر فن کاغذ سازی کو پہلے سمرقند و بغداد میں پھر تمام دنیا میں پھیلا دیا۔ مشرقی دنیائے اسلام سے یہ صنعت گیارھویں صدی میں مراکش پہنچی اور وہاں سے آبنائے جبل الطارق کو عبور کر کے بارھویں صدی میں اسپین میں بمقام شاطبہ مکمل ترقی حاصل کر لی۔ کہتے ہیں کہ سب سے قدیم کاغذی مخطوطہ جو ہم تک آیا ہے عبداللہ القاسم بن سلام (ف ۲۲۳ھ) کا موسوم بہ غریب الحدیث مورخہ ذوالقعدہ ۲۵۲ھ م نومبر ۳ یا دسمبر ۱۲ ۸۶۶ء ہے اور جامعہ لیڈن کے کتب خانہ میں محفوظ ہے جامعہ ازہر قاہرہ میں بھی اس مخطوطہ کی نقل مورخہ سنہ ۳۱۱ھ م (۹۲۳ء) محفوظ ہے۔ اسپین ہی سے کاغذ عیسائی یورپ میں منتقل ہوا۔ اسپین ہی سے روئی، ریشم، حریر بافی، شکر، چاول، سائنٹفک زراعت اور نہروں کے ذریعہ آبرسانی یورپ میں رائج ہوئے انگریزی لفظ (ream) فرانسیسی (rayme) ہسپانی (resma) سے نکلا ہے جو عربی لفظ رزمہ بمعنی پلندہ سے بنا ہے۔ عبدالرحمن ثالث اور حکم کی علمی سرپرستی اور علماء کی قابلیت سے تمام دنیا واقف ہے۔ یورپ کی تہذیب میں ان دونوں نے جو حصہ لیا ہے اس کو ظاہر کرنے کے لئے کئی لکچر درکار ہوں گے۔

علی بن حزم (سنہ ۹۹۴ء ۔ سنہ ۱۰۶۴ء) ہسپانی علما ادب و اصول مذہب میں قابل تعین مانا جاتا ہے ایام شباب میں عبدالرحمن المستظہر اور ہشام المعتد کے تحت دوبار ان کے عہدہ وزارت کو سنبھالا ۔ اندلس کی خلافت بنی امیہ کے برخاست ہونے پر گوشہ تنہائی اختیار کرکے مطالعہ و تصنیف میں مشغول رہا ۔ ابن خلکان اور قفطی نے اس کی تصنیفات تاریخ دینیات و ادب کی تعداد ۴۰۰ تک بتائی ہے ۔ طوق الحمامہ عشقیہ مضامین کا مجموعہ ہے مگر الفصل فی الملل والاہواء والنحل گرانقدر تصنیف مذاہب کی تنقید پر پہلی کتاب ہے ۔ یورپ میں کسی اور سے سولھویں صدی تک اس قسم کا کام نہ ہو سکا ۔

تنگی وقت کی وجہ سے اسپین کے مورخین مثلاً ابن القوطیہ (م سنہ ۹۷۷ء) مصنف تاریخ افتتاح الاندلس ابومروان حیان بن خلف (سنہ ۹۸۷ء ۔ سنہ ۱۰۷۶ء) جس کی پچاس کتابوں بس المتین (۶۰) جلدوں پر مشتمل تھی ، ابوالولید عبداللہ بن محمد الفرضی (م سنہ ۹۹۲ء) مصنف تاریخ علماء الاندلس ابن بشکوال مصنف صلاح ، ابو عبیدہ محمد بن الآبار (سنہ ۱۱۹۹ء ۔ سنہ ۱۲۶۰ء) مصنف الحلۃ السیراء ، ابوجعفر احمد ابن یحییٰ الضبی مصنف بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال الاندلس وغیرہ کا سرسری ذکر بھی ممکن نہیں مگر لسان الدین ابن الخطیب (سنہ ۱۳۱۲ء ۔ سنہ ۱۳۷۴ء) اور عبدالرحمن بن خلدون (سنہ ۱۳۳۲ء ۔ سنہ ۱۴۰۶ء) ایسے مشہور و ممتاز نام ہیں کہ ان کے متعلق دو ایک باتیں کہنا ناگزیر ہے ۔ دونوں عربی النسل تھے ابن الخطیب نصری سلطان یوسف بن الحجاج اور اس کے بیٹے محمد پنجم کے زمانہ میں ذوالوزارتین کے لقب سے ممتاز تھا درباری سازشوں سے بچنے کی غرض سے فاس کو بھاگ گیا مگر وہاں بھی دشمنوں نے اس کو نہ چھوڑا گلا گھونٹ کر قتل کر دیا ۔ اس کی کتاب الاحاطہ فی تاریخ غرناطہ مشہور ہے ۔ تلمسان کے المقری نے اپنی کتاب نفح الطیب کا آخری نصف حصہ ابن الخطیب کے سوانح حیات اور تصانیف پر وقف کر دیا ہے ۔ ابن خلدون پہلے فاس میں عہدہ ہائے جلیلہ پر مامور تھا پھر سلطان غرناطہ کے دربار میں ملازمت اختیار کی اس کے بعد ایک عرصہ تک

تاریخ نویسی میں مشغول رہا آلاخر القاہرہ میں مملوک سلطان الظاہر برقوق کے عہد میں صدر قاضی مقرر ہوا اور الناصر برقوق کے جانشین کے ساتھ تیمور لنگ کی جنگ بھی دیکھی اس کی کتاب العبر و دیوان المبتداء و الخبر فی ایام العرب والعجم والبربر فن تاریخ میں لاجواب تصنیف ہے اس کا مقدمہ بتاتا ہے کہ وہ تاریخ نویسی کا استاد اور عمرانیات کا موجد تھا۔ مسلمانوں میں فلسفہ تاریخ کا سب سے بڑا مصنف تھا اور تمام دنیا کے سب سے بڑے مورخوں میں سے تھا۔

گیارھویں صدی کا سب سے مشہور جغرافیہ نویس ہسپانی عرب ابو عبید عبداللہ بن عبدالعزیز البکری تھا اس کی کتاب المسالک والممالک کے چند حصے باقی رہ گئے ہیں عبداللہ محمد بن محمد الادریسی مصنف کتاب رجاری (نہایۃ المشتاق فی اختراق الآفاق) جو سبطہ (Ceuta) میں سنہ ۱۱۰۰ء میں پیدا ہوا ہسپانی عرب خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور جغرافیہ و نقشہ نویسی میں ازمنہ وسطی کا امام تھا۔ ابن جبیر ابوالحسین محمد بن احمد (ل سنہ ۱۱۴۵ء) غرناطہ سے مکہ معظمہ تک مصر شام و عراق ہوتا ہوا سفر کیا جب کہ ان آخری تین ملکوں کے بعض حصص ہنوز عیسائی صلیبی جنگجویوں کے قبضہ میں تھے اور حالات سیاحت اپنی کتاب رحلہ میں شائع کئے۔ غرناطہ کے ایک اور ہسپانی عرب ابو الحامد محمد المازنی اسفرنا۔ سنہ ۱۱۷۰ء نے تحفۃ الالباب میں اپنے سفر روس (سنہ ۱۱۳۶ء) و خطہ دریائے والگا کے نہایت دلچسپ حالات بیان کئے ہیں ان کے مطالعہ سے میمتھ (Mammoth) ہاتھی کے رکازی دانتوں (عاج) کی تجارت کا پتہ چلتا ہے جو خوارزم تک جاری تھی لیکن ان سیاحوں کے سفر سیاح الارض ابن بطوطہ کے سفروں کے مقابلہ میں مدھم پڑ جاتے ہیں جو طنجہ میں (سنہ ۱۳۰۴ء) میں پیدا ہوا اور مراکش (سنہ ۱۳۷۷ء) میں فوت ہوا۔ چودھویں صدی کے دوسرے ربع حصہ میں اس نے مکہ معظمہ کے چار سفر کئے اور اس سفر کے ساتھ لنکا۔ بنگالہ۔ جزائر،

مالدیپ و چین میں بھی گشت لگائی۔ عربوں کی ان جغرافی تصنیفات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ زمین کی کروی شکل سے بخوبی واقف تھے۔ ابوعبیدہ مسلم البلنسی دسویں صدی کے پہلے نصف دور میں اس رائے کو وضاحت کے ساتھ ظاہر کرتا ہے۔ انہی مصنفوں کی تحریرات کا نتیجہ تھا جو کولمبس کو امریکہ کی تلاش کی ہمت ہوئی ورنہ پندرھویں صدی کے بعد تک بھی یورپ کے عیسائی زمین کو چپٹی ہی مانتے تھے۔

ہسپانیہ کے عرب منجموں میں قرطبہ کے ابوالقاسم مسلمہ المجریطی سنہ ۱۰۰۷ء الحاسب جس نے الخوارزمی کی زیج کی تصحیح اور تدوین کی طلیطلہ کے ابو اسحٰق ابراہیم بن یحییٰ الزرقالی (سنہ ۱۰۲۹ سنہ ۱۰۸۷) اور اشبیلیہ کے جابر بن افلاح سنہ ۱۱۴۵ء کا شمار دنیا کے سب سے بڑے محققین میں ہوتا ہے ان کی فلکی مشاہدات اور زیجیں لاطینی ترجموں کے ذریعہ سولہویں صدی تک بھی سند مانی گئیں۔ الفونسو دہم (ف سنہ ۱۲۸۴ء) نے ان ہی کی تحقیقات کو فراہم کرکے اپنے مشہور جداول تیار کئے الزرقالی نے میل طریق الشمس کی جو قیمت نکالی قوس کے دقیقہ کی حد تک صحیح ہے اس نے بحیرہ متوسط کا طول ۴۲° ناپا جو اصلی طول سے بہت قریب ہے اس سے پہلے بطلیموس نے اس کی قیمت ۶۲ درجے اخذ کی تھی اور الخوارزمی نے ۵۲ درجے۔ کوپرنیکس نے اپنی کتاب (De Revolutionibus Orbium Celestium ,) میں الزرقالی اور البتانی کے حوالے دئے ہیں۔ نورالدین ابواسحٰق البطروجی (ف قریب سنہ ۱۲۰۴) شاگرد ابن طفیل و مصنف کتاب الہیہ نے بطلیموس کے سیاروی نظام کی تنقید کی لیکن بہتر نظام قائم نہ کر سکا۔ سطح قمر پر عرب اور عجم کے چند منجموں کے نام سے حال ہی میں سے نے ہندوستانی ادب میں جو مضمون شائع کیا ہے اس میں ۱۳ کے سوانح حیات اور علمی کارنامے لکھے ہیں۔ مزید لکھنا غیر ضروری سمجھتا ہوں۔

اسپین کے عرب ... نے نباتیات کی اس زمانہ کی معلومات میں بہت اضافہ

کیا۔ نباتات کے خواص واقسام ونشوونما کے متعلق حکیمانہ انکشافات شائع کئے۔ قرطبہ کے طبیب ابوجعفر احمد بن محمد الغافقی (ف ۱۱۶۵ء) نے اسپین وافریقہ میں نباتات جمع کئے اور ان کے عربی لاطینی اور بربری ناموں کے ساتھ ان کی ترتیب وار تشریح کی اس کا شاہکار الادویہ المفردہ بعد کو آنے والے محققین کے لئے بہت کارآمد ثابت ہوا۔ ابوزکریا بن محمد بن العوآم اشبیلی کی کتاب الفلاحت نہ صرف مسلمانوں کی اس فن کی تصانیف میں بلکہ سارے قرون وسطی کے لئے ارفع مرتبہ رکھتی ہے۔ اس میں (۵۸۵) پودوں کا ذکر ہے اور (۵۰) سے زائد میوہ کے درختوں کی کاشت نگہداشت کے بہترین مجرب طریقے بتائے گئے ہیں۔ نہ صرف یہی بلکہ درختوں کے امراض ان کے علاج زمین کی تاثیر کھاد اور پیوند کے طریقوں پر بھی وضاحت کے ساتھ لکھا گیا ہے انہی تجربوں کی وجہ سے اسپین زمانہ دراز تک فلاحت وزراعت میں سارے یورپ پر سبقت لے گیا۔

اسپین کا سب سے زیادہ مشہور ومعروف ماہر نباتیات وفن دواسازی ملاقہ کا عبداللہ بن احمد ابن البیطار تھا۔ نباتات کی تلاش میں اس نے اسپین اور شمالی افریقہ کا سفر کر کے بالآخر قاہرہ میں ایوبی سلطان الملک الکامل کے دربار میں ملازمت قبول کی مصر سے شام اور ایشیائے کوچک کے بھی دورے لگائے۔ اس کی ایک کتاب مغنی فی الادویہ المفردہ سادہ دوائیوں سے متعلق ہے اور دوسری الجامع فی الادویۃ المفردہ سادہ ملاجوں کا مجموعہ ہے اس میں کوئی (۱۴۰۰) اشیاء پر بحث ہوئی ہے جن میں (۲۰۰) نباتات ہیں اور ان (۳۰۰) میں (۲۰۰) بالکل نئے ہیں۔ (۱۵۰) مصنف بطور حوالہ پیش کئے گئے ہیں جن میں سے صرف (۲۰) یونانی ہیں۔ اس کتاب کے لاطینی ترجمہ (Simplicia) کے چند جزو ۱۷۵۸ء تک بنام کریمونا طبع ہوئے ہیں۔

بہت سارے ہسپانی حکماء کو طبابت میں بھی دخل تھا۔ لیکن وہ انکا پیشہ نہ تھا۔ علم طب کو انہوں نے فلسفیانہ نقطۂ نظر سے دیکھا تھا۔ ابن رشد، ابن میمون، ابن باجہ اور ابن طفیل کا اس زمرہ میں شمار ہوتا ہے۔ ابن الخطیب عہدہ وزارت پر مامور تھا لیکن تاریخ طبابت اور ادب میں بھی کافی مہارت رکھتا تھا۔ چودھویں صدی میں جب کہ یورپ کے عیسائی طاعون کو قسمت کی طرف سے آئی ہوئی بلا سمجھ کر علاج اور حفاظت نہیں کرتے تھے اس مسلم حکیم نے اس کے متعدی ہونے اور اس سے بچنے کے تدابیر پر شرح و بسط کے ساتھ لکھا ہے۔

عربوں کا سب سے بڑا جراح ابو القاسم خلف بن عباس الزہراوی الحکم ثانی کا درباری حکیم تھا (ف سنہ ۱۰۱۳ء) اس کی کتاب التصریف لمن عجز عن التالیف کے آخری حصہ میں اس وقت کی تمام جراحی کی معلومات شامل ہیں۔ مثلاً زخموں کا جلانا مثانہ کے اندر پتھری کا پھوڑنا اور فصد لینے اور قطع و برید کرنے کی ضروریات۔ جراحی کا یہ حصہ لاطینی میں ترجمہ کیا گیا (مترجم جیرارڈ کریمونائی تھا) اس کی مختلف ایڈیشنیں شائع ہوئیں۔ وینس میں ۱۴۹۷ء میں بازل میں ۱۵۴۱ء میں اور آکسفرڈ میں ۱۷۷۸ء میں وہ صدیوں تک سلرنو۔ مونٹ پیلیر اور دیگر مقامات میں شریک نصاب رہا۔ اس میں آلات جراحی کی شکلیں بھی بتائی گئی تھیں جو عربوں اور یورپ کے جراحوں کے لئے نہایت مفید ثابت ہوتی رہیں اس کا رفیق حاسدے شاپروط بادشاہ کا طبیب اور وزیر بھی تھا اور ڈاسکوریڈیز (سنہ ۶۵ء) کے ایک بالتصویر قلمی نسخہ میٹیریا میڈیکا کا جو بازنطائنی شہنشاہ کانسٹانٹائن ہفتم نے عبدالرحمن ثالث کے پاس بطور تحفہ بھیجا تھا عربی میں ترجمہ کیا۔

زہراوی کا طب میں جواب ابو مروان عبد الملک بن ابی العلا بن زہر (Avenzoar) تھا جو اسپین کے ایک نہایت مشہور سلسلہ اطباء کا رکن تھا

تھا اس کی تاریخ وفات (سنہ ۱۰۹۱ - ۱۰۹۴) کے مابین ہے اور مقام ولادت اشبیلیہ عرصہ دراز تک عبدالمومن بانی خاندان موحدین (سلاطین اسپین و مراکش) کے دربار میں وزیر اور طبیب تھا۔ اس کی چھ تصنیفوں میں سے صرف (۳) موجود ہیں جن میں سب سے زیادہ قابل قدر التیسیر فی المداوہ والتدبیر ہے جو اس کے دوست ابن رشد کی، خلاصت پر اس کی کتاب کلیات کے مقابلہ کے لئے لکھی گئی تیسیر میں ہڈیوں کے احساس اور صابت الجرب (خارشت کے کیڑوں) پر بحث کی گئی ہے گیارھویں صدی کے آخری نصف میں احمد الطبری نے معالجۃ البقراطیہ میں خارشت کے کیڑوں پر ابن زہر سے پہلے تحقیق کی ہے

عربی اصطلاحیں یورپ کی اکثر زبانوں میں (بشمول انگریزی) بکثرت موجود ہیں خصوصاً ہیئت اور ادویہ کے متعلق ان پر اچھی خاصی کتاب لکھی جا سکتی ہے

اسی طرح ہسپانی عربوں وغیرہ کے فلسفہ کا اثر یورپ کی اقوام پر بہت وسیع ثابت ہوا ہے۔ اس پر ذمہ دار اشخاص نے تنقیدی کام کیا ہے مجھ کو فلسفہ سے سرسری واقفیت ہے اس لئے صرف محققین کے نام ان کی تصانیف اور مختصر حالات بیان کر سکتا ہوں (Ben Gabirol) بن جابیرول (ال سنہ ۱۰۲۱ متوفی قریب سنہ ۱۰۵۸ء) ملقب بہ یہودی افلاطون نیو پلاٹونزم کے مغربی حامی کی تصنیف ینبوع الحیات کا لاطینی ترجمہ سنہ ۱۱۵۰ (Fons vitae) قرون وسطی کے اسکولاسٹیزم پر بڑا اثر پڑا فرانسسکن فرائروں نے اپنے مذہبی جذبات و تخیل میں اس سے بہت کچھ مستعار لیا ہے مسلم فلسفہ کے ترجمان ابوبکر محمد ابن یحیی ابن باجہ ف سنہ ۱۱۳۸ (Avempace) مصنف تدبیر المتوحد، ابوبکر محمد بن عبدالملک ابن طفیل (ف سنہ ۱۱۸۵ مراکش میں) وزیر و درباری طبیب موحد ابو یعقوب یوسف (۱۱۶۳ - سنہ ۱۱۸۴) مصنف حی بن یقظان اور ابوالولید محمد بن احمد بن رشد قرطبی (سنہ ۱۱۲۶م سنہ ۱۱۹۸) مصنف

تہافت التہافت (جواب تہافت الفلاسفہ الغزالی) جامع، تلخیص وتفسیر و کلیات فی الطب (جس میں آنکھ کے پردہ شبکیہ کا صحیح عمل اور ایک شخص کا چیچک میں عموماً ایک سے زیادہ مرتبہ مبتلا ہونا صراحت سے بتایا گیا ہے) اور ابوعمران موسےٰ بن میمون حکیم (یہودیوں کا موسیٰ ثانی) مصنف الفصول فی الطب و دلالت الحائرین دنیا ئے علم کی بڑی مشہور ہستیاں ہیں اور ان کے تصانیف موجودہ زمانہ میں بھی مطالعہ کے قابل ہیں۔

اس عہد کے ممتاز و ہردلعزیز صوفی ہسپانی عرب ابوبکر محمد بن علی محی الدین ابن عربی الشیخ الاکبر (ولادت سنہ ۱۱۶۵ء مرسیہ میں وفات سنہ ۱۲۴۰ء دمشق میں) مصنف الفتوحات المکیہ فصوص الحکم الاسرار الی مقام الاسرار کی تعلیمات کا اثر نہ صرف مسلم اقوام کو مذہبی سکون قلب عطا کیا ہے، بلکہ اہل مغرب کو بھی۔

عربی علم وحکمت کے لاطینی ترجمے کوہ پیرینیز (Pyrenees) کو عبور کرکے پہلے کلانی (فرانسس) اور لوتھارنجیہ (لورین) پہنچے۔ لیئج گورز، کولون (Liege Gorze, Cologne) عربی زبان وحکمت کی تعلیم کے مرکز بنے۔ وہاں سے جرمنی کے دوسرے حصوں میں اور پھر آرسن انگلستان میں اس تعلیم کو فروغ ہوا۔

صقلیہ کے بپتسمائے ہوئے سلطان روجر دوم اور اس کا پوتا فریڈرک دوم آف ہوہنشاوفن نے بھی بطور خاص عربی علم و ہنر تہذیب و تمدن کی قدر پہچانی اور اپنی حق شناسی سے ان کو اپنے وسیع علاقوں میں رواج دیا اور اس طرح ان کو کوہ الپس کے پار شمال مغربی ممالک پر پھیلا دیا۔

بنی عباسیہ کا زور ٹوٹنے پر فاطموی خاندان مصر اور شام پر سنہ ۹۰۹ء سے سنہ ۱۱۷۱ء تک حکمران رہا۔ جن کے (۱۳) بادشاہ گزرے ہیں سب سے پہلا المہدی

اور آخری العاضد ہے ان میں سب سے زیادہ مشہور الحاکم ہے اگرچہ مذہبی عقائد کے لحاظ سے کسی قدر بدنام ہے اس کو ہیئت سے انس تھا۔ علی بن یونس ف سنہ ۱۰۰۹ء اور علی الحسن بن الہیثم از سنہ ۹۶۵ء بصرہ ہیں ف سنہ ۱۰۳۹ء قاہرہ ہیں اس کے آسمان علم ہیئت و طبیعیات کے بدر کامل تھے۔ ابن یونس نے فلکی مشاہدات العزیز کے حکم سے سنہ ۹۹۰ء میں شروع کئے دور الحاکم کے زمانہ حکومت میں سنہ ۱۰۰۷ء میں ختم کئے۔ الزیج الکبیر جو الحاکم کے نام سے معنون تھی بہت مشہور ہے اس میں کسوف و خسوف قدیم و جدید کے واقعات میل طریق الشمس کی جدید تعیین ۲۳° ۳۵ / آفتاب کے اوج کے طول بلد کی قیمت ۸۶° ۱۰' استقبال اعتدالین ۰٫۵۲ سالانہ اور شمسی اختلاف منظر ۲ درج ہیں۔ المامون کے عہد میں کرۂ زمین کے درجۂ عرض بلد کی جو پیمائشیں ہوئی تھیں وہ بھی بیان کی گئی ہیں۔ ابن یونس نے کروی مثلثات کے بعض مسائل بھی حل کئے۔ ابن ہیثم مسلمانوں میں سب سے بڑا ماہر طبیعیات تھا۔ اس کی کتاب علم المناظر سے جو بمقام بازل سنہ ۱۵۷۲ء میں طبع ہوئی کیپلر نے بہت استفادہ کیا اس میں کروی و مکافی آئینوں سے انعکاس نور، کروی ضلالت۔ انعطاف نور کی توضیح و تعیین (جداول کی شکلوں میں) شفق کی صحیح توجیہہ عدسوں کے خواص وغیرہ پر عالمانہ و محققانہ بحث کی گئی ہے، دو مزدوج نقطوں کے لئے انعکاس نور کی صورت میں واثری سطح کی غیر مفصل ہوئیت کے مسئلہ کو (جو ابن الہیثم کے مسئلہ کے نام سے مشہور ہے) جس میں چوتھے درجے کی مساوات حل کرنی پڑتی ہے اس نے خود خط زاید اور دائرہ کے تقاطع کی مدد سے حل کیا اسی طرح اس نے المامانی اور ارشمیدس کے مسئلہ کو حل کیا جس میں کعبی مساوات سے سابقہ پڑتا ہے۔

جب پوپ اربن دوم کی کلیر مونٹ والی تقریر نے ۶ نومبر سنہ ۱۰۹۵ء کو صلیبی جنگ کے لئے تمام عیسائی یورپ کو مسلمانان فلسطین و شام کے خلاف بھڑکا دیا تو نہ بنی

عباسیہ کے نام نہاد حکمران اس آفت ناگہانی کا مقابلہ کر سکے اور نہ مصر کے فاطمی۔ عیسائی جو ہیں سنہ ۱۱۴۴ء تک بلاد اسلام کو تاخت و تاراج کرتی رہیں بالآخر الموصل کے اتابک عماد الدین زنگی نے ان سے الرہا چھین لیا پھر نور الدین محمود زنگی نے حلب پر قبضہ کیا اور سنہ ۱۱۵۴ء میں طغتگین کے بیٹے سے دمشق لے کر ایک طاقتور سلطنت کی بنیاد ڈالی صلاح الدین کا چچا شیرکوہ نور الدین کا سپہ سالار تھا اس کا باپ ایوب بعل[redacted]کا حاکم تھا۔ شیرکوہ کے مرنے پر صلاح الدین (ال سنہ ۱۱۳۸ء۔ ف سنہ ۱۱۹۳ء) جو ابتداً سپہ گری کا چنداں دلدادہ نہ تھا فاطمی حکومت کو صلیبیوں کے مقابلہ کے لئے نااہل دیکھ کر ختم کر دیا اور بمقام حطین سنہ ۱۱۸۷ء میں فرنگیس کو بری طرح شکست دے کر آہستہ آہستہ بلاد اسلام کو صلیبیوں کے قبضہ سے واپس لینا شروع کیا۔ رچرڈ اول انگلستان نے اس کی شجاعت حق پرستی اور مہمان نوازی سے محجوب ہو کر اس کے بھائی العادل سے اپنی بہن کا عقد کروانا چاہا اور جہیز میں یروشلم ان کے حوالہ کرنا چاہا مگر پادریوں نے منظور نہ کیا۔ ایوبی سلسلہ صلاح الدین کی خود مختارانہ سلطنت کے قیام سنہ ۱۱۶۹ء سے شروع ہو کر الاشرف پر سنہ ۱۲۵۲ء میں ختم ہوتا ہے۔ ایوبیوں نے نہ صرف صلیبیوں کو شکست دی بلکہ شکستہ و بوسیدہ مصر و شام کو تہذیب و تمدن سے از سر نو آراستہ کیا۔ صلاح الدین نے رفاہ عام کے قابل قدر کام کئے۔ نہریں کھدوائیں مدارس قائم کئے مساجد تیار کروائے قاہرہ کا قلعہ اس کے زمانہ میں بننا شروع ہوا۔ اس کے وزراء میں القاضی الفاضل اور عماد الدین کاتب الاصفہانی مشہور عالم تھے۔ اس کے سوانح حیات کا مصنف اس کا آخری معتمد بہاء الدین ابن شداد گذرا ہے۔

صلاح الدین کے جانشین سلطان بھی علم و حکمت کے حامی تھے۔ چنانچہ العادل سیف الدین کے فرزند ابن الفائز ابراہیم اور المعظم عیسی حاکمان مصر و دمشق نے رضوان بن محمد بن علی فخر الدین الساعاتی کو دمشق کے باب الجیرون رجو بعد کو باب الساعات

کے نام سے مشہور ہو گیا) کی مشہور گھڑی کی نگرانی پر مامور کیا۔ رضوان نے ۱۲۰۳ء میں اس گھڑی کی ساخت اور استعمال پر ایک کتاب بھی لکھی گھڑی کا موجد رضوان کا باپ محمد بن علی بن رستم الخراسانی الساعاتی تھا۔ اس کے بعد رضوان نے اس کی مرمت کی۔ ابن جبیر فزدی اور ابن بطوطہ نے بھی اس گھڑی کا ذکر کیا ہے۔

المعظم نے مہذب الدین ابو محمد عبد الرحیم بن علی الدمشقی ابن الدخوار (استاد ابن ابی اصیبعہ و ابن النفیس) کی بھی بڑی قدر کی اور اس کو عہدۂ جلیلہ سے سرفراز کیا۔

اگرچہ عربی زبان میں گھڑی کا تذکرہ سب سے پہلے الجاحظ کی کتاب الحیوان میں جو نویں صدی کے دوسرے نصف دور میں لکھی گئی موجود ہے۔ اس مضمون پر سب سے بہتر اور مکمل تحریر ابو العز عماد الدین رزاز بدیع الزمان الجزری کی تصنیف کتاب المعرفتہ الحیل الہندسیہ میں درج ہے جو ناصر الدین محمود ارتقی (حاکم دیار بکر از ۱۲۰۱ تا ۱۲۲۲ء) کے لیے ۱۲۰۵ یا ۱۲۰۶ء میں لکھی گئی تھی اس میں آبرسانی اور دیگر حیلی مسائل پر بھی بحث کی گئی ہے اور میکانیات پر عربی میں بہترین تصنیف سمجھی جاتی ہے۔

اس خاندان کا ایک شاہی رکن اسمٰعیل ابو الفداء (ل ۱۲۷۳ء ف ۱۳۳۱ء) حاکم حماۃ اگرچہ ۱۲ برس کی عمر سے جنگوں میں شریک رہا لیکن علم و حکمت کا دلدادہ تھا اس کی مختصر تاریخ البشر ابن الاثیر کی ضخیم تاریخ کا خلاصہ ہے لیکن اس میں خود ابو الفداء کے زمانہ تک کے تاریخی واقعات شامل ہیں اس کی جغرافی معلومات بھی کافی وسیع تھیں اس نے مختلف مقامات کے عرض بلد اور طول بلد دریافت کر کے قلمبند کئے۔ اس کے علاوہ اس کو ہیئت میں بھی اچھا درک حاصل تھا۔

پندرھویں صدی میں مملوک سلاطین کے دور میں ابوالمحاسن ابن تغری بردی (سنہ ۱۴۱۱ء - سنہ ۱۴۶۹ء) مصنف النجوم الزاہرہ فی ملوک مصر والقاہرہ نے مصر کی تاریخ عربوں کے فتح کرنے سے لے کر سنہ ۱۴۵۳ء تک لکھی ہے۔ جلال الدین السیوطی (سنہ ۱۴۴۵ء تا ۱۵۰۵ء) مصنف الاتقان فی علوم القرآن، المزہر فی علوم اللغہ، حسن المحاضرہ فی اخبار مصر والقاہرہ، ابن الجوزی (سنہ ۱۱۱۴ء - سنہ ۱۲۰۱ء) مصنف المنتظم اور ابن حزم کی طرح بڑا ہی جید عالم تھا۔ قرآن، حدیث، فقہ، فلسفہ، تاریخ، لسانیات، بلاغہ وغیرہ پر اس کی (۵۶۰) کتابوں کی فہرست موجود ہے۔

العادل کا بیٹا الکامل مصر کا مالک بنا۔ فرینکس کو دمیاط سے نکالا مگر مصلحتاً یروشلم کو فریڈرک دوم کے حوالہ کیا۔ سنہ ۱۲۴۴ء میں الکامل کے بیٹے ملک الصالح نے خوارزمی ایوب نجم الدین کو دعوت دے کر ترکوں کے ذریعہ فرینکس کو بالآخر یروشلم سے نکال ڈالا۔

فرانس کے بادشاہ لوئی نہم نے چھٹی صلیبی جنگ چھیڑ دی اور جب کہ الصالح بستر مرگ پر فریش تھا مصر پر چڑھائی کر دی لیکن سنہ ۱۲۵۰ء اپریل میں وہ معہ اپنے سرداروں کے مسلمانوں کے ہاتھ اسیر ہو گیا۔ الصالح کی بیوہ شجرالدر نے اس کی وفات کا راز اس کے بیٹے توران شاہ کے عراق عجم سے آنے تک چھپا رکھا۔ توران شاہ اس ایوبی خاندان کا آٹھواں بادشاہ تھا لیکن الصالح کے غلاموں (مملوک سرداروں) سے اس کی نہ بن سکی بالآخر انہوں نے اس کو قتل کر کے اشرف موسیٰ کو جو دمشق کے ایوبی خاندان کا چھ برس کا لڑکا تھا سلطان منتخب کیا۔ عنان سلطنت شجرالدر ہی کے ہاتھوں میں رہی۔ الصالح ایوب کے مرنے پر شجرالدر نے سپہ سالار فوج عزالدین ایبک سے شادی کر لی جس نے لوئی نہم کو شکست دی تھی۔

عزالدین ایبک بحری مملوک سلاطین کے سلسلہ کا پہلا فرد ہے یہ سلسلہ ۱۲۵۰ء سے شروع ہو کر حاجی الصالح پر سنہ ۱۳۹۰ء میں ختم ہوتا ہے اس مدت میں ۲۴ بحری سلطان ہوئے۔ اس سلسلہ میں المظفر سیف الدین قطز سنہ ۱۲۵۹ء الملک الظاہر رکن الدین بیبرز الملک المنصور سیف الدین قلاؤں اور الملک الاشرف بہت ممتاز بادشاہ گذرے ہیں۔ بیبرز نے تاتاریوں کو عین جالوت پر سنہ ۱۲۶۰ء میں شکست فاش دی۔ اور بعد کو صلیبی جنگجوؤں کی بھی پوری سرکوبی کی۔ اسی بنا پر اس کا نام عربی دنیا میں بہت مشہور ہوا۔ اس کے درباری شاعر عنترہ نے اس کے عہد کے قصوں کو الف لیلہ کے افسانوں سے بھی زیادہ رونق بخشی۔ سیف الدین قلاؤں نے تاتاریوں کو بمقام حمص سنہ ۱۲۸۰ء میں شکست دی اور ان سے فارغ ہو کر صلیبی جنگجوؤں کا قلع قمع کیا بحری مملوک سلاطین نے اسلامی تہذیب و تمدن کو ہمیشہ کے لئے تاتاریوں اور صلیبی حملہ آوروں سے بچا لیا وہ نہ صرف میدان رزم کے فاتح تھے بلکہ امن و معاشرت کے بھی علمبردار تھے۔ ان کے بیمارستان اور کارہائے تعمیرات اب بھی مصر و شام کے لئے مایۂ فخر بنا رہی۔ الملک المنصور قلاؤں (حکومت سنہ ۱۲۷۹ء۔ سنہ ۱۲۹۰ء) کا بیمارستان المنصوری مع مدرسہ طبیہ و مسجد قاہرہ میں سنہ ۱۲۸۴ء میں تکمیل کو پہنچا۔ کہتے ہیں کہ قلاؤں جب بیمارستان نوری واقع دمشق میں زیر علاج تھا عہد کیا تھا کہ بعد صحت قاہرہ میں ایک ایسا ہی بیمارستان تعمیر کرے گا چنانچہ دس لاکھ درہم اس کے لئے وقف کر کے اپنا عہد پورا کیا۔ میعادی بخار امراض چشم پیچش وغیرہ کے بیماروں اور مردوں اور عورتوں کے لئے وارڈ علیحدہ علیحدہ قائم تھے (بحوالہ خطاط مقریزی جلد دوم صفحات (۴۰۶ - ۴۰۷) مشہور ہے کہ قلاؤں کا لباس جو اس کے مقبرہ میں محفوظ رکھا گیا ہے اس زمانہ تک بھی ہزاروں خوش عقیدہ مریض گونگے بچے بانجھ عورتیں وغیرہ اس کو چھوتے ہیں تاکہ شفا نصیب ہو۔ بیمارستان نوری نور الدین کا بنایا ہوا تھا یہ دمشق میں ابو لسید کے

بیمارستان کے بعد دوسرا تھا (بحوالہ ابن جبیر و ابن خلکان) افسوس ہے کہ اس عمارت کا اب نشان بھی باقی نہیں رہا۔ سلطان صلاح الدین نے بھی قاہرہ میں نہ صرف اپنا مشہور مدرسہ صلاحیہ قائم کیا بلکہ دو ہسپتالیں بھی قائم کیں۔ (بحوالہ ابن جبیر)۔ ان کے زمانہ میں امراض چشم کے معالج بھی صفحہ تاریخ پر اپنا نام لکھ گئے ہیں۔ حلب کے خلیفہ ابن ابی المحاسن (۱۲۵۶ء) مصنف کافی فی الکحل اور حماد کے صلاح الدین بن یوسف مصنف نور العیون وجامع الفنون (۱۲۹۶ء) نے چار دانگ عالم میں عربی حکمت کو شہرت دلائی۔ نور العیون انیسویں صدی تک بھی یورپ و ایشیا میں امراض چشم پر بہترین تصنیف مانی گئی۔

زبان عربی اور اسلامی دینیات میں احمد النویری (ف ۱۳۳۲ء) کی تصنیف نہایت العرب فی فنون الادب مصر و شام کی تاریخی و جغرافی معلومات میں احمد القلقشندی (ف ۱۴۱۸ء) کی تصنیف صبح الاعشار (۱۴ جلدیں) سے مستشرقین نے وہاں کے اس زمانہ کی طرز حکومت وغیرہ کے متعلق بہت مواد فراہم کیا ہے۔

برجی مملوک سلاطین کی حکومت مصر و شام پر ۱۳۸۲ء سے ۲۲ جنوری ۱۵۱۷ء تک قائم رہی۔ اس سلسلہ کا آخری سلطان تومان بک تھا اس تاریخ کو عثمانی ترکی سلطان سلیم نے اسے قاہرہ کے پاس شکست دی اور مصر کو سلطنت عثمانیہ کا صوبہ بنا لیا۔ مملوک سلاطین کے عہد کا سب سے ممتاز مورخ تقی الدین احمد مقریزی (۱۳۶۴ء–۱۴۴۲ء) ہے جس کا شاہکار المواعظ والاعتبار فی ذکر الخطاط والآثار ہے۔

یہ امر مسلمہ ہے کہ عرب بڑے سیاح تھے۔ تجارت اور ملک بینی کا شوق ان کو وطن سے براہ بری و بحری ہزارہا میل دور تک گشت کراتا تھا۔ بحری سفر بجز فن جہازسازی و جہازرانی ناممکن تھے ابتدا میں انہوں نے بازنطینین یونانیوں سے مدد ضرور لی ہوگی لیکن وہ بذات خود ترقی کر گئے۔ ان کے جہازوں کے ناخدا مختلف بندرگاہوں کے نقشوں سے بخوبی واقف تھے اگرچہ ان کے جن نقشوں کا

پتہ چلاتا ہے ان کی تاریخ بعد کو آنے والی یوروپی قوموں کے نقشوں سے پرانی نہیں ہے
تاہم ان کے سفر خود اس بات کی دلیل ہیں کہ وہ ابتدا ہی سے اپنے نقشے آپ خود
بناتے اور استعمال کرتے تھے۔ یہ ضرور نہ تھا کہ ان نقشوں کو عوام کی اطلاع کے لئے شائع
کرتے اسی طرح قطب نما کے استعمال سے بھی وہ بخوبی واقف تھے اس کو انہی کی ایجاد
تصور کرنا چاہیئے اگرچہ چینیوں کو مقناطیسی سوئی کی قطب نمائی کا بہت پہلے سے علم تھا
لیکن انہوں نے اس کو اس کام میں استعمال کرنا عربوں سے سیکھا۔ نجد کے احمد بن ماجد
کی کتاب الفوائد فی اصول البحر والقواعد میں (جس کو جی فرّان (G. Ferrand)
نے پیرس میں ۱۹۲۱ء سے ۱۹۲۳ء میں شائع کیا ہے) نظری وعملی جہاز رانی پر بحث کی گئی
ہے عام طور پر مشہور ہے کہ احمد بن ماجد ہی نے پرتگالی سیاح واسکوڈاگاما کے جہاز کی
۱۴۹۷ء میں ناخدائی کی ہے۔

(ابوالحسن علی الاشعری اور ابو حامد الغزالی کے متعلق اڈورڈز اخادب کے خیالات
ظاہر کرنے کا اس مضمون میں ایک جگہ موقعہ ملا تھا۔ لیکن حالیہ مغربی تحقیقات کے
بموجب ان بزرگوں کا اثر کسی طرح اکتساب علوم دنیوی کا مانع نہیں ہوا ہے۔ مسلمانوں کے
ہاتھ سے علم و ہنر کی باگ نکل جانے کے اسباب متعدد اور پیچیدہ ہیں۔ یہ امر ظاہر ہے کہ بس
ہے کہ جب وہ خانہ جنگیوں اور طوائف الملوکی کی وجہ سے عیسائی یورپ کی روز افزوں
قوت کا مقابلہ نہ کر سکے تو ان کے ہاتھ سے حکومت نکل گئی اور اس کے ساتھ علم و
حکمت کا حاصل کرنا بھی جاتا رہا۔ الاشعری ساکن بغداد (تاریخ وفات ۹۳۶ء) اور الغزالی
ساکن طوس تاریخ پیدائش ۱۰۵۸ء وفات ۱۱۱۱ء کے نسبت صرف اتنا لکھنا مناسب
سمجھنا ہوں کہ اول الذکر اسلام کے اسکولاسٹیسزم یعنی علم کلام کے موجد تھے اور آخر الذکر
کلام اور تصوف دونوں پر حاوی تھے۔ ان کے شہکار احیاء علوم الدین نے نہ
صرف مسلمان دہریت سے بچے ہیں بلکہ اس کے بعض حصوں کے لاطینی و عبرانی ترجمے

عیسائیوں اور یہودیوں کے لئے بھی لامذہبیت کا سدباب ثابت ہوئے ہیں۔

عربی علم و حکمت کی تاریخ زیادہ تر ابن ابی یعقوب الندیم الوراق مصنف فہرست (وفات ۹۹۵ء) دمشق کے موفق الدین ابو العباس احمد ابن ابی اصیبعہ (۱۲۰۳ء–۱۲۷۰ء) مصنف عیون الانباء فی طبقات الاطباء اور علی بن یوسف القفطی (۱۱۷۲ء) مصنف اخبار العلماء بہ اخبار الحکماء کی ممنون ہے مجھ کو اکثر و بیشتر مواد جدید ترین انگریزی و امریکی محققین کی تصنیفات سے ملا ہے خصوصاً جارج سارٹان کی تاریخ سائنس اور فلپ الخوری ہٹی کی تاریخ عرب سے) اور وہ بھی بالکلیہ ان ہی مورخین کے ممنون احسان ہیں۔ دارالترجمہ جامعہ عثمانیہ میں الطبری ابن الاثیر اور ابن الخطیب وغیرہ کی کتابوں کے ترجمے زبان اردو میں شائع ہوئے ہیں میں نے ان سے بھی کافی استفادہ کیا ہے۔

ضمیمہ

مختصر تاریخی حالات

مشرقی فتوحات عہد بنی امیہ

فتوحات کا دور اول	حضرت عمرؓ و حضرت عثمانؓ کی عہد خلافت میں شام، العراق، ایران اور مصر فتح ہو چکے تھے
فتوحات کا دور ثانی	عبدالملک بن مروان (۶۸۵ء – ۷۰۵ء) اور الولید (۷۰۵ء – ۷۱۵ء) کے عہد میں شروع اور ختم ہوا۔

شمالی افریقہ کی حقیقی فتح سنہ ۶۷۰ء سے شروع ہوئی جبکہ عقبہ بن نافع نے القیروان کو عربوں سے آباد کیا اور بڑے پیمانہ پر شہر کی بنیاد رکھی یہ قرطاجنہ (Carthage) کا جانشین بنا۔ عقبہ ۶۸۳ء میں بمقام بسکرہ شہید ہوئے۔ حسان بن نعمان الغسانی نے بربروں کی بغاوت کو ۶۹۳ء میں فرو کیا اور ان کو عربوں کی حکومت

کا تابع بنایا۔ بائزنطائن حکومت کا رہی سہی سلطنت سنہ ۶۹۰ء میں نکال دی گئی اور کاہنہ قتل کی گئی۔ حسان کے بعد موسے بن نصیر نے طنجہ لے لیا سلطنت کی "تعریب" عبدالملک کے زمانہ میں شروع ہوئی۔ اس نے سنہ ۶۹۵ء میں دمشق میں پہلا سونے کا دینار اپنے نام سے رائج کیا اور چاندی کا درہم۔

عبدالملک علاوہ بڑا فاتح ہونے کے فن تعمیر کا مربی بھی تھا اس نے یروشلم میں قبتہ الصخرہ (Dome of the Rock) اور ایک دوسری مسجد (مسجد الاقصی) بھی تعمیر کرائی۔ الولید اس کا بیٹا بھی تعمیر کا بڑا حامی تھا بلکہ بنی امیہ میں وہی سب سے بڑا حامی تعمیر تھا۔

عبدالملک کے زمانہ میں سلیمان کے بھائی مسلمہ نے (سنہ ۶۹۲ء) میں جسٹینین ثانی (Justinian) کو کلیشین سیباسٹوپس (Clicium) (Sebastopolis) کے قریب شکست دی اس کے بعد کیپاڈوشیہ (Cappadocia) کا سب سے بڑا قلعہ اطوانہ (Tyana) فتح کیا گیا۔ پھر اگست سنہ ۷۱۶ء سے ستمبر سنہ ۷۱۷ء تک مسلمہ نے قسطنطنیہ کا محاصرہ کیا۔ (یہ دوسرا محاصرہ تھا۔ پہلا محاصرہ سنہ ۶۶۹ء میں یزید بن معاویہ نے کیا تھا۔ برائے امداد فضلان بن عبید الانصاری (ترکی قصہ متعلق حضرت ابوایوب انصاری) السید الغازی البتال بعد۔ کے سنہ ... کے حملہ میں شہید ہوئے ان کا مزار عکی شہر کے قریب ہے)

مسلمانوں کا دوسرا ثانی فتوحات مشرق میں حجاج ابن یوسف الثقفی سے متعلق ہے اور مغرب میں موسے ابن نصیر سے حجاج کے سپہ سالار عبدالرحمن بن الاشعث امبارز کابل) قتیبہ بن مسلم (مشرقی ترکستان کے حملہ آور) اور اس کا رشتہ دار محمد بن قاسم (بلوچستان، سندھ وغیرہ کے حملہ آور) تھے۔

الولید کے زمانہ میں قتیبہ نے جیحون (Oxus) کو عبور کر کے ۷۰۵ء سے ۷۱۲ء تک بلخ بخارا، سمرقند خیوا (خوارزم) کو فتح کیا۔ ۷۱۳ء تا ۷۱۵ء میں اس نے جیحون سے اس طرف کے ممالک (فرغانہ اور وسطی ایشیا کے علاقوں میں) فوج کشی کی۔ بعد کو ہشام (۷۲۴ء۔ ۷۴۳ء) نے نصیر بن سیّار کو ما وری النہر کا حاکم مقرر کیا۔ اور اس نے چینی ترکستان میں کاشغر فتح کیا ما بین ۷۳۸ء۔ ۷۴۰ء اور بالآخر ۷۵۱ء میں الشاش یعنی تاشقند کو بھی۔ محمد بن قاسم نے مکران، بلوچستان اور سندھ ۷۱۱ء۔ ۷۱۲ء پر تسلط حاصل کر کے ۷۱۳ء میں ملتان کو بھی فتح کر لیا۔

حجاج بن یوسف نے ۔۔۔ بنی امیہ کی حکومت العراق وغیرہ میں مستحکم کی بلکہ نہریں جاری کر کے وہاں کی زراعت کو بھی فروغ دیا۔ مہذا عربی حروف کے امتیازی نقاط اور تحریری عبارتوں کے ساتھ اعراب (زبر، زیر، پیش) بھی مروج کئے۔

عبد الملک کے چوتھے بیٹے ہشام کے بعد بنی امیہ سلاطین کی قوت میں انحطاط شروع ہو گیا۔

اسپین اور جنوب مغربی فرانس میں عربوں کی فتوحات

شمالی افریقہ کے حاکم موسےٰ بن نصیر کے ایک ملازم نے جولائی ۷۱۰ء میں بربروں کی ایک چھوٹی جماعت کے ساتھ جزیرۃ الطریف پر قبضہ کیا۔ ۷۱۱ء میں موسےٰ نے طارق ابن زیاد کی ہمراہ ایک نسبتہً بڑی فوج بربروں کی روانہ کی اس نے گوتھک فرمانروا فریڈرک کو دریائے باربیٹ کے دہانہ پر شکست دی الولید کے زمانہ میں آرکاڈیا، قرطبہ، ملاغہ، البویرا اور ٹولیڈو (طُلَیطلہ) فتح ہو گئے اور موسےٰ فروری ۷۱۵ء میں مالِ غنیمت اور اسیر وزیری گوتھک شہزادوں کو لے کر دمشق میں داخل ہوا۔ لیکن سلیمان نے موسےٰ کے ساتھ بہت برا سلوک کیا اور وہ

حجاز میں حالتِ افلاس میں انتقال کر گیا۔

اس کے بعد سنہ ۷۱۷ یا سنہ ۷۱۸ میں الحرّ بن عبدالرحمن الثقفی نے کوہ پیرینیز (Pyrenees) کو عبور کیا۔ اس کا جانشین السمح ابن مالک الخولانی سنہ ۷۲۰ میں ناربون (Narbonne) فتح کیا لیکن ڈیوک آف اکوٹین (Aquitaine) سے شکست کھا کر شہید ہو گیا۔

پھر عبدالرحمن بن عبداللہ الغافقی نے سنہ ۷۳۲ میں کوہ پیرینیز کو عبور کیا اور بورڈو (Bordeaux) پر حملہ کر کے قبضہ کر لیا لیکن گال (Gaul) میں داخل ہوا تو ٹور (Tours) کے قریب دریائے لوار (Loire) چارلز مارٹل نے اس کو شکست دی۔

کچھ عرصہ تک اسپین کے مسلمان خانہ جنگیوں میں مبتلا رہے اور فرانس میں آگے نہ بڑھ سکے۔ چنانچہ سنہ ۷۱۶ میں عبدالعزیز بن موسیٰ بن نصیر جو اشبلیہ پایہ تخت اندلس کا سب سے پہلا حاکم (گورنر) مقرر ہوا تھا قتل ہو گیا۔ کلبی اور یمنی عرب قبائل کی باہمی لڑائیاں مسلمانوں میں انتہائی انتشار برپا کر دی تھیں آخر عبدالرحمٰن اول (خاندان بنی امیہ کا پسماندہ شہزادہ) الداخل نے اسپین پر اپنا تسلط قائم کر لیا۔

اسپین میں کل آٹھ بنی اموی امیر (پایہ تخت قرطبہ) حکمران رہے۔ سب سے زیادہ مشہور اور کامیاب حکمران عبدالرحمٰن ثالث تھا جو سنہ ۹۱۲ سے سنہ ۹۲۹ تک امیر اور پھر سنہ ۹۶۱ تک خلیفہ کہلایا۔

(عبدالرحمٰن دوم (الاوسط) چار شخصوں کے زیر اثر تھا۔ ایک اس کی چہیتی بیوی طروب، دوسرا خواجہ سرا نصر، تیسرا فقیہ ذی مرتبت یحییٰ بن یحییٰ شاگرد امام مالک ابن انس، چوتھا مطرب و مغنی زریاب)۔ اس کے انتقال کے بعد اسپین کے صوبجات باغی ہو گئے۔ عمر بن حفصون نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا۔

الاوسط کے مین حیات ہی عیسائی عورتوں اور مردوں کو دین اسلام کے خلاف شرارت کرکے بسزاے موت حاصل کرنے کا بیحد شوق ہوا چنانچہ فلورا اور یولوجیس کے قصے مشہور ہیں۔

آخر کار عبدالرحمٰن سوم نے ان تمام شرارتوں بغاوتوں اور غداریوں کو فرو کرکے مستحکم حکومت قائم کرلی۔ الزہرا کا محل اپنی چہیتی بیوی کے لیے بنایا۔ سلافوم کے ملازموں کا باڈی گارڈ مقرر کیا اس کا یہودی وزیر حاسدے شارپت اس کا حکیم بھی تھا۔ یہودیوں نے مسلمان بادشاہ کے ساتھ وفاداری برتی۔ تجارت کو بہت ترقی ہوئی۔ جہازوں کی بڑی جماعت حمل و نقل سامانِ تجارت میں مشغول تھی شاہی آمدنی سالانہ (۶۲) لاکھ ۴۵ ہزار دینار تک پہنچ گئی بقول اس کے (۴۹) سال سے زاید مدت حکومت میں اس کو صرف (۱۴) خوشی کے دن نصیب ہوئے۔

عبدالرحمٰن سوم اور الحکم دوم (۹۶۱ء ۔ ۹۷۶ء) کے عہد خلافت میں مسلمانوں کا زور اسپین میں معراج کو پہنچ گیا تھا۔ الحکم کے بعد الحاجب المنصور کی آمریت (۹۷۶ء ۔ ۱۰۰۲ء) بھی مسلمانوں کے عروج کے زمانہ میں شامل ہوسکتی ہے۔

الحکم ثانی کے زمانہ میں زراعت، میوہ کی کاشت اور پارچہ بافی کی صنعتوں کو بہت ترقی ہوئی۔ اسی طرح کاغذ سازی اور کتابوں کی جلد بندی اور فلزات کے کام بھی بہت بلند معیار کے ہونے لگے۔ الحکم خود بھی بڑا عالم تھا۔ اس کے کتب خانہ میں چار لاکھ کتابیں تھیں جن میں سے بہت ساری اس کی مطالعہ کی ہوئی اور حاشیہ پر خود اس کے قلم سے شرح لکھی ہوئی تھیں۔ کتابوں کے ناموں کی فہرست چوالیس جلدوں میں مدون ہوئی تھی۔ بادشاہوں میں اس علمی قابلیت کا شاید ہی کوئی گذرا ہو۔ قرطبہ میں ابتدائی تعلیم عام ہوگئی تھی بقول ڈوزی تقریباً ہر شخص نوشت و خواند

سے واقف تھا۔ مدارس میں ہر قسم کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جامعہ قرطبہ کے استاذ مشاہیر عالم سے تھے۔ مثلاً ابن القوطیہ تاریخ کا ماہر، ابو علی القالی (مصنف امالی) وغیرہ الاغانی کے مصنف کو کتاب کے لکھے جانے ہی پر ایک ہزار دینار کا عطیہ بھیجا اور پہلا نسخہ طلب کر لیا گیا۔

الحکم کے بعد کو آنے والے بنی اموی پادشاہ کمزور ثابت ہوئے۔ ان کے زوال پر حمودی خاندان کا جس کا بانی علی ابن حمود تھا۔ سنہ۱۰۱۶ء سے سنہ۱۰۵۷ء تک عروج رہا پھر طوائف الملوکی شروع ہوئی۔

سنہ۱۰۲۳ء سے سنہ۱۰۹۱ء تک بنو عباد حکمران رہے۔ ان کا پایہ تخت اشبیلیہ تھا۔ المعتمد آخری پادشاہ بڑا شاعر تھا اس کا وزیر ابن عمار ابتداً بازاری بے سروسامان شاعر تھا۔ المعتمد نے اس کی شعرگوئی کی قدر کرکے اس کو وزیر بنایا۔ بعد کو اس نے اپنے محسن سے غداری کی اور بالآخر اس کی پاداش میں مارا گیا۔ المعتمد کی بیوی عماد بھی فی البدیہہ شعر کہتی تھی یہی کمال اس کے ملکہ بننے کا باعث ہوا۔

عیسائی حملہ آوروں سے بچنے کے لئے المعتمد نے یوسف ابن تاشفین بانی خاندان المرابط (حکمران مراکش) سے مدد مانگی یوسف نے پہلے مدد کی لیکن بعد کو خود ہی اسپین کا مالک بن بیٹھا اور المعتمد اس کی بیوی اور لڑکیاں فلاکت کی حالت میں شمالی افریقہ میں پناہ گزیں ہوئے۔ المرابط (ملثمون) کے پانچ حکمران سنہ۱۰۹۰ء سے سنہ۱۱۴۷ء تک اسپین میں حکومت کئے ان کا آخری امیر المسلمین اسحق تھا۔ المرابط دینار کے ایک طرف خطاب امیر المسلمین کے ساتھ امیر کا نام ہوتا تھا اور دوسری طرف امام کے ساتھ اس وقت کے بنی عباسیہ خلیفہ کا نام۔ اس کی تقلید میں الفونسو ہشتم حاکم لیون اور قسطیلیہ (Leon and Castile) نے اپنے دینار کے ایک طرف عربی میں الامام القتاقص [illegible]

امام البیعہ المسیحین اس وقت کے پاپائے روم کا نام ظاہر کیا تھا) المرابط کے آخری دور میں مذہبی تعصب بہت شدید صورت میں رونما ہوا مستعرب دیسی عیسائیوں نے بری طرح بغاوت شروع کر دی اسی زمانہ میں روڈریگو ڈیاز ڈی بیوار (Rodrigo (Diaz de Bivar, Cid Campeador) نے شہرت حاصل کی المرابط کے بعد الموحد خاندان حکمران ہوا۔ اس کا بانی بربر ابن تومرت تھا لیکن عبدالمومن بن علی (جو ۱۱۴۵ء سے ۱۱۶۳ء تک امیر تھا) بہت فتوحات کئے۔ اس کی سلطنت میں اسپین اور تمام شمالی افریقی ساحل بحر ظلمات سے لے کر مصر تک شامل تھے۔ اس کا پوتا یوسف ابو یعقوب المنصور (۱۱۸۴ء۔ ۱۱۹۹ء) بڑا ذی اقتدار بادشاہ تھا۔ (ابن طفیل اور ابن رشد اس کے زمانے کے بڑے مشہور فیلسوف تھے اس نے صلیبیوں کے خلاف صلاح الدین کے لکھنے پر ۱۰۰ جہاز بھیجکر مسلمانوں کی مدد کی۔ رباط الفتح بنایا اور اشبیلیہ کا جیرالڈا اور ہسپتال بھی تعمیر کیا لیکن اس کے بعد محمد الناصر (۱۱۹۹ء۔ ۱۲۱۴ء) ہسپانی عیسائیوں سے جہاد کر کے عہدہ برا نہ ہو سکا۔ الاقاب لاس ناواس ڈی ٹولسا پر (Las Navas de Toloso) پر بری طرح شکست کھائی۔ اس کے بعد اسپین کے حصے بخرے ہو گئے بہت سارے عیسائیوں کے قبضہ میں آئے اور کچھ مقامی مسلمان امیروں کے۔

غرناطہ پر نصری حکومت رہی اس خاندان کا بانی محمد ابن یوسف ابن نصر تھا جو مدینہ کے بنو خزرج قبیلہ سے تھا نصری خاندان ۱۲۳۲ء سے ۱۴۹۲ء تک حکمران رہا۔ آخری دور میں تو عیسائی بادشاہوں کا باجگزار تھا لیکن علم و ہنر کی پرورش میں کوئی کمی نہیں ہوئی۔ لسان الدین ابن الخطیب (یوسف ابو الحجاج ثانی غرناطہ کے وزیر) نے اس عہد کے تاریخی حالات لکھے ہیں۔ نصری خاندان کا آخری بادشاہ ابو عبداللہ تھا۔ ۲ جنوری ۱۴۹۲ء کو قسطیلیہ کی عیسائی فوج غرناطہ میں داخل ہو گئی اور ابو عبداللہ نے اپنے ساتھیوں

کے ملک سے باہر چلا گیا۔ کچھ مدت فاس میں مقیم رہا اور ۵۳۳ء یا ۳۴ میں وہاں مر گیا۔ المقری جس وقت اپنی تاریخ لکھ رہا تھا اس وقت (۱۶۲۷ء یا ۲۸) ابو عبداللہ کے پسماندگاں کی گذر اوقات خیرات پر ہوتی تھی۔

سقوط غرناطہ کے بعد سے ۱۶۱۰ء تک کوئی تیس لاکھ ہسپانی مسلمان یا تو ملک سے باہر نکال دئے گئے یا قتل کر دئے گئے فلپ سوم نے ان کے اخراج کے حکم پر دستخط کئے۔

مراکش کے قزاق (Corsairs) زیادہ تر انہی خارج شدہ ہسپانی عربوں اور بربروں میں سے تھے۔

ازریاب کا عبدالرحمن دوم کے زمانہ میں اسپین میں خیر مقدم کیا گیا تھا اس نے مشروبات کے لئے فلزی پیالے استعمال کرنے کے بجائے شیشہ کا جام رائج کیا موسیقی کو بھی اس کی وجہ سے عام مقبولیت ہوئی اس کے بعد ابو القاسم عباس ابن فرناس (تاریخ وفات ۸۸۸ء) نے مشرقی موسیقی کو مغربی یورپ میں اور بھی پسند عام گردانا۔ مسلمانوں کی تاریخ میں یہ پہلا شخص ہے جس نے اڑنے کی کوشش کی اور جیسا کہ کہا جاتا ہے پر کے لچھوٹے لگا کر اور پروں کا لباس پہن کر ہوا میں دور تک اڑ سکا لیکن اترتے وقت اس کے چوٹ آئی اس لئے کہ سنبھالنے کے لئے دم نہیں لگائی گئی تھی۔ اس زمانہ میں جبکہ بغیر بیرونی میکانی طاقت کے ہوا کے بالائی نفوذ کی مدد سے پرواز کے مختلف طریقے رائج ہو چکے ہیں ابن فرناس کی پرواز کی تفصیل معلوم کرنا مفید ثابت ہوگا۔ اس مواد کی تلاش کی جانی چاہیئے۔ اس نے اپنی ذہانت طبع سے ایک پلانیٹیریم بھی بنایا جس میں ستاروں کی حرکت اور ابر و برق کے کرشمے بھی بتائے جاتے تھے۔

دور الموحدین میں ابن سبعین نے (تاریخ وفات ۱۲۶۹ء) فن موسیقی پر کتاب

الادوار المنسوب تصنیف کی۔ بہت سے عربی یا عربی کے توسط سے مشرقی الفاظ یورپ کی زبانوں میں آلات موسیقی وغیرہ کے لئے مستعمل ہیں مثلاً (anafil) النفیر (naker) نقارہ (Pandero) بندیر طنبورہ (Guitar) قیتار (Rebec) رباب (sonajas) صنوج etc. (فریڈرک دوم ہوہنشاوفن نے ابن سبعین اور مشرق میں کمال الدین بن یونس سے فلسفیانہ و حکیمانہ امور کے متعلق چند استفسارات کئے اور جواب آنے پر انعام بھیجا لیکن ابن سبعین نے انعام قبول نہیں کیا) عربی زجل اور موشح کے زیر اثر اسپین اور فرانس میں صوفیانہ شعر گوئی اور گیتوں کی بڑی قدر ہونے لگی رزمیہ فرانسیسی گیت (Chanson de Roland) مسلم اسپین اور عیسائی تصادم کا نتیجہ ہے۔ قرطبہ، اشبیلیہ، ملاغہ اور غرناطہ میں مشہور جامعات قائم ہوئیں یہاں تمام یورپ سے لوگ تحصیل علم کے لئے آتے تھے۔

ساتویں نصری امیر یوسف ابو الحجاج نے ۱۳۳۳ یا ۴۴ میں غرناطہ کی جامعہ بنائی۔

عبد الرحمن سوم کا درباری شاعر ابن عبد ربہ (۸۶۰ء۔ ۹۴۰ء) مصنف عقد الفرید تھا۔ مسلم اسپین کا سب سے جید عالم اور جدت پسند دماغ کا انسان علی ابن حزم تھا (۹۹۴ء۔ ۱۰۶۴ء) جس کی کتابیں متعدد شعبہ جات علم و حکمت پر لکھی گئی تھیں۔ یہ خود اپنے آپ کو ایرانی النسل سمجھتا تھا لیکن اہل یورپ کہتے ہیں کہ اس کا دادا ہسپانیہ کا عیسائی تھا جو مشرف باسلام ہو گیا وہ بنی امیہ کے آخری ہسپانوی دور کے شکستہ حال بادشاہوں عبد الرحمن المستظہر اور ہشام المعتد کے دربار میں خدمت وزارت پر ممتاز تھا۔ بنی امیہ کا دور ختم ہونے پر وہ گوشہ نشینی اختیار کر کے مطالعہ اور تصنیف میں مشغول رہا۔ ابن خلکان اور القفطی نے لکھا ہے کہ اس نے (۴۰۰) کتابیں ادب،

مذہب تاریخ اور حدیث پر لکھیں ان میں سب سے مشہور طوق الحمامہ عشقیہ مضامین کے اشعار کا مجموعہ ہے اور الفصل فی الملل والاہوا والنحل مختلف مذاہب کی تفہیم و تنقید ہے جیسا کہ اس سے پہلے صفحہ (۲۶) پر بیان کیا جا چکا ہے۔

القالی (سنہ ۹۰۱ تا سنہ ۹۶۷) جامعہ قرطبہ میں پروفیسر تھا۔ اس کا مقام پیدائش آرمینیا ہے اور اس نے تعلیم بغداد میں پائی اس کا سب سے قابل شاگرد محمد ابن الحسن الزبیدی (سنہ ۹۲۸ تا سنہ ۹۸۹) اشبیلیہ میں پیدا ہوا اور اس کو الحکم نے اپنے بیٹے ہشام کی تعلیم و تربیت کے لئے منتخب کیا۔ لسانیات کے ماہرین کے سوانح حیات کے مصنف السیوطی نے اپنی کتاب کی تالیف میں اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔

عربی گرامر ہی کو پیش نظر رکھ کر یہودی مصنف عبرانی گرامر ابوزکریا یحییٰ ابن داود نے قرطبہ میں گیارہویں صدی میں عربی اصول پر عبرانی گرامر لکھی۔ اصطلاحات اور تعریفات بالکل عربی ہی کے ترجمے ہیں

نوجوان شوخ اور رندانہ شاعر ابن ہانی (سنہ ۹۳۷ تا سنہ ۹۷۳) کا شمار دوسرے درجہ کے شعرا میں ہوتا ہے ابوبکر بن قزمان نے (تاریخ وفات سنہ ۱۱۶۰) سوقیانہ زجل کو ادب کے معیار تک بلند کیا محمد بن یوسف ابوحیان سنہ ۱۲۵۶ تا سنہ ۱۳۴۴ غرناطہ کا بربر النسل عالم متعدد زبانوں پر حاوی تھا اور موشح کہتا تھا اس نے ایرانی اور ترکی گرامر لکھی اور کہا جاتا ہے کہ حبشی (Ethiopic) زبان پر بھی ایک نامکمل کتاب شروع کی۔

اسپین کی جامعات میں ہیئت الافلاک۔ ریاضیات، لسانیات، طب دینیات حدیث وغیرہ کی اعلیٰ سے اعلیٰ تعلیم دی جاتی تھی۔ ہزاروں بیرونی اور ہسپانی طلبہ اس میں تحصیل علم سے مشرف ہوتے تھے۔

اسپین کے مورخین میں ابوبکر بن عمر بن القوطیہ قرطبہ میں پیدا ہوا اور وہیں سنہ ۹۷۷ میں فوت ہوا اس کی تصنیف تاریخ افتتاح الاندلس میں عربوں کی فتوحات سے لے کر

عبدالرحمٰن ثالث کے ابتدائی دور تک کے حالات مذکور ہیں۔

ابومروان حیان ابن خلف (۹۸۷ء۔ ۱۰۷۶ء) نے چالیس کتابیں لکھیں جن میں سے المتین رسالہ جلدوں پر مشتمل ہے۔ اس کی تصانیف میں سے صرف المقتبس فی تاریخ اندلس بچ رہی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ ابوالولید احمد بن زیدون (۱۰۰۳ء۔ ۱۰۷۱ء) اندلس کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اس کو شہزادی ولادہ سے عشق تھا کچھ زمانہ تک قید کے مصائب جھیلے۔ بعد کو المعتضد العبادی کا وزیر اعظم اور سپہ سالار فوج ذوالوزارتین کے لقب سے سرفراز ہوا۔ شعر گوئی کے علاوہ نامہ نویسی (مثلاً خط متعلق ابن عبدوس) میں بھی اس کو کمال حاصل تھا۔

[دور الموحدین پر سب سے بہتر تاریخ عبدالواحد المراکشی کی لکھی ہوئی ہے جو ۱۲۲۴ء میں شائع ہوئی المعجب فی تلخیص اخبار المغرب]

قرطبہ کا ابوالولید عبداللہ بن محمد بن الفرضی (تاریخ ولادت ۹۶۲ء) جامعہ مذکور میں معلم تھا بعد کو القیروان ہوتا ہوا مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کا حج کیا۔ واپسی پر بلنسیہ کا قاضی مقرر ہوا۔ اور قرطبہ کی لوٹ مار میں مقتول ہوا اس کی نعش کئی دنوں بعد پہچانی گئی۔ الفرضی تاریخ علمائے اندلس کا مصنف تھا۔ اس کے بعد ابن بشکوال ابوالقاسم خلف بن عبدالملک (۱۱۰۱ء۔ ۱۱۸۳ء) مقام ولادت قرطبہ نے اس کتاب کا ضمیمہ بہ لقب الصلاح فی تاریخ ائمۃ الاندلس ۱۱۳۹ء میں شائع کیا اور بعد ازاں ابوعبداللہ محمد بن الآبار (۱۱۹۹ء۔ ۱۲۶۰ء) بلنسی نے اصلاح کو تکملہ کتاب الصلاح لکھ کر مکمل کیا۔ اس نے الحلۃ السیرا بھی لکھی۔

ابوجعفر احمد بن یحییٰ الضبی (تاریخ وفات ۱۲۰۳ء) مرسیہ میں نشو و نما پایا اور بغیۃ الملتمس فی تاریخ رجال الاندلس تصنیف کی۔ تاریخ سائنس بھی ابوالقاسم سعید بن

احمد الطلیطلی نے (جو ذوالنون حضرات کے عہد میں طلیطلہ کا قاضی تھا) خود بھی مورخ ریاضی داں اور ماہر مشاہدات فلکی تھا ایک کتاب طبقات الامم لکھی (سنہ ۱۰۲۹ء - سنہ [illegible]) نصری درباروں کے سب سے بڑے اور مشہور مورخ ابن الخطیب اور ابن خلدون ہیں۔

اسپین کے مسلمان علماء نے نباتیات، طب فلسفہ اور ہیئت الافلاک یا نجیم پر بہت تحقیقات کئے احمد ابن محمد الغافقی نے نباتیات میں بہت کام کیا لیکن ابن بیطار کا نباتیات میں سب سے مشہور نام ہے اس کے علاوہ عبداللطیف نے مصر پر جو کتاب تصنیف کی اس میں نباتیات کے متعلق بھی مفید معلومات پائے جاتے ہیں ابو العباس النباتی اشبیلی نے بارہویں صدی کے آغاز میں اسپین اور شمالی افریقہ اور عرب کے ساحل کا دورہ کرکے نباتات فراہم کئے بحر قلزم کے کنارے اس نے متعدد نئے نباتات دریافت کئے اور اپنی کتاب الرحلہ میں ان کے مفصل حالات بیان کئے۔

اگر مسلمان آٹھویں صدی میں اسپین کے عیسائی اقوام کو جب کہ وہ پہاڑوں میں پناہ لے کر چھپے تھے پوری طرح شکست دیتے اور خانہ جنگیوں میں گرفتار ہوتے تو ایسی بے سروسامانی سے ملک سے خارج نہ کئے جا سکتے۔ لیون (Leon) اور قسطیلہ (Castile) کا انضمام اور اتحاد سنہ ۱۲۳۰ء میں ہوا طلیطلہ کا سقوط سنہ ۱۰۸۵ء میں ہو چکا تھا۔ قرطبہ سنہ ۱۲۳۶ء میں عیسائیوں کے قبضہ میں چلا گیا اور اشبیلیہ سنہ ۱۲۴۸ء میں آخر سنہ ۱۴۹۲ء جون کی دوسری کو غرناطہ سے مسلمان خارج ہو گئے۔

[المقری لکھتا ہے کہ اندلس کی عہد ولادہ کی عورتیں اعلیٰ درجہ کی تعلیم یافتہ اور سخن گو تھیں۔ ابن قزمین (تاریخ وفات سنہ ۱۱۶۰ء) لکھتا ہے کہ شلب (Silvia) (جنوبی پرتگال میں) ہل چلانے والا کسان بھی نظم کہہ سکتا تھا۔

اسپین کے مشہور منجموں میں البطروجی - الزرقالی - جابر بن افلح (تاریخ وفات

سنہ۱۱۸۵ء میں ۔ یوسف المومتن قبیلہ بنی ہود (سنہ۱۰۸۵ ۱۰۸۱ء) امیر سرغوسا (Saragossa) ریاضی داں تھا اس کی کتاب استکمال مشہور ہے ۔ اس کتاب کے متعلق جوزف بن جودہ ابن عقنین (زمانہ بارھویں صدی کا نصف دوم) نے لکھا ہے کہ وہ اقلیدس اور المجسطی اور متوسطی کتابوں کے ساتھ پڑھی جانی چاہیئے ۔ افسوس ہے کہ اس کا کوئی نسخہ موجود نہیں ہے ۔

زوال بغداد کے دوران مشرق میں چھوٹی سلطنتوں کا عروج

طاہری دور سنہ۸۲۰ء سے سنہ۸۷۲ء تک المامون نے اپنے یک چشمی فتحیاب سپہ سالار (ایرانی نژاد) طاہر بن الحسین کو الامین کو شکست دینے کے بعد سنہ۸۲۰ء میں خراسان کا حاکم بنایا ۔ اس نے مرو اپنا دار الخلافہ قرار دیا اور مرنے سے دو برس پہلے خود مختار بن بیٹھا اس کے جانشیں اپنا دار الحکومہ نیشاپور بنائے آخر صفاریوں نے ان سے ملک چھین لیا ۔

صفاری دور اس خاندان کا بانی یعقوب بن اللیث المنصور تھا ۔ سجستان پر ان کی حکومت تھی اور سنہ۹۰۳ء میں یہ ختم ہو گئی ۔

سامانی دور سنہ۸۷۴ء ۔ سنہ۹۹۹ء یہ خاندان فارس اور ماوراء النہر پر حکمران رہا ۔ اس کا بانی نصر بن احمد زردشتی سامان کی نسل سے تھا وہ اور اس کا بھائی اسمعیل ابتداءً امیر یا عامل کہلاتے تھے مقام دار الخلافہ بخارا و سمرقند رہے ابو بکر زکریا الرازی نے اپنی مشہور کتاب المنصوری ابو صالح منصور بن اسحق کے نام سے معنون کی ۔

بعد کو نوح ثانی نے سنہ۹۷۶ء یا سنہ۹۹۷ء میں نوعمر ابن سینا کو (جس کا باپ ایک اسمعیلی فرقہ کا آدمی تھا) اپنے دربار میں مدعو کیا اور وہ اس کے کتب خانہ سے استفادہ

کیا۔ سامانیوں کے دور میں جدید فارسی کا نشو و نما ہوا۔ فردوسی (سنہ ۹۳۴ء - سنہ ۱۰۲۰ء) کی پیدائش اسی عہد میں ہوئی۔ بلعمی منصور اول کا سنہ ۹۶۱ء سے سنہ ۹۷۶ء تک وزیر تھا۔ ابن حوقل نے اس کے زمانہ وزارت میں ملک کی اندرونی ترقیوں کی بڑی تعریف کی ہے۔ الطبری کی تاریخ کا فارسی زبان میں خلاصہ لکھا گیا۔ سنہ ۹۹۲ء میں غزنویوں نے دریائے سیحون کے تمام جنوبی حصہ پر قبضہ کر لیا اور ترکستان کے ایلک خاں نے سنہ ۹۹۹ء میں بخارا کو فتح کر لیا اور سامانی خاندان کو ختم کر دیا۔

غزنوی دور سنہ ۹۶۲ء - سنہ ۱۱۸۶ء۔ الپتگین سامانیوں کا ملازم تھا۔ سنہ ۹۶۱ء میں خراسان کا حاکم مقرر ہوا۔ سنہ ۹۶۲ء میں غزنین فتح کیا۔ اس کے داماد سبکتگین نے مقبوضات اتنے وسیع کئے کہ افغانستان کے علاوہ سندھ میں پشاور اور فارس بہ خراسان اس کے زیر حکم آ گیا۔ اس کے بعد جو سولہ غزنوی بادشاہ گزرے ہیں وہ سب اسی کی نسل سے تھے۔ سلطان محمود غزنوی (سنہ ۹۹۶ء - سنہ ۱۰۳۰ء) نے خلیفہ القادر کے زمانہ میں بویہ حکمرانوں سے عراق عجم بشمول اصفہان و رے چھین لیا اس کے دربار میں علماء و شعراء کی بڑی قدر رہی جن میں العتبی مورخ عنصری فردوسی شاعر اور البیرونی حکیم مشہور ہیں۔

(بغداد میں بنی عباس یہ کاروبار نام قائم تھا ترک کی ذلیل جنگ سنہ ۹ سے سنہ ۹۴۳ء تک جاری رہی اس زمانہ میں مصر زیر حکومت ابن طولون خود مختار بن گیا خلیفہ المستکفی نے دسمبر سنہ ۹۴۵ء میں احمد بن بویہ کو امیر الامرا بنا کر اپنا رہا سہا زور بھی کھو دیا۔ اس کے بعد معز الدولہ نے شیعیت کو بہت قوت کے ساتھ فروغ دیا۔ پھر عماد الدولہ و رکن الدولہ وغیرہ نے حکومت کی اس طرح بویہ کی امیری ۹۴۵ء سے کر سنہ ۱۰۵۵ء تک جاری رہی۔ عضد الدولہ (سنہ ۹۴۹ء - سنہ ۹۸۳ء) اس خاندان کا سب سے بڑا حکمران تھا۔ اس کے عہد میں بغداد کی حکومت ہارون الرشید

کی حکومت کے برابر وسیع ہو گئی۔ اس نے خلیفہ الطائع کی لڑکی سے شادی کی اور اپنی ایک لڑکی اس کے عقد میں لائی تاکہ اس سے جو اولاد نرینہ پیدا ہو خلیفہ بن سکے۔ اس نے بڑے بڑے رفاہی کام کئے مسکویہ اس کا خزانہ دار تھا۔ مشہد میں حضرت علیؓ کے متعینہ مزار پر مقبرہ بنوایا اور بیمارستان العضدی بغداد میں ایک لاکھ دینار کے وقف کے ساتھ تیار کیا جس میں (۲۴) طبیب کام کرتے تھے اگرچہ اس کا پایہ تخت شیراز تھا لیکن وہ بغداد اور دوسرے شہروں پر بھی بہت روپیہ صرف کیا اور ان کو آراستہ کیا۔ پرانی نہریں صاف کرائیں اور مساجد تیار کرائے۔ اس کے وزیر (عیسائی) نصر ابن ہارون کے ذریعہ منظوری خلیفہ شکستہ عیسائی گرجاؤں اور خانقاہوں کی مرمت کرائی گئی متنبی نے اس کی تعریف میں قصیدے کہے ہیں۔ علی الفارسی نے اپنی کتاب الایضاح اوس کے نام سے معنون کی۔ عضدالدولہ پہلا مسلمان تھا جو شہنشاہ کہلایا۔

عضد کا ایک بیٹا شرف الدولہ اپنے باپ کے قدم بقدم چلکر علمی کاموں کو فروغ دیا اور بغداد میں ایک رصدگاہ قائم کی اس کے ایک اور لڑکے بہاءالدولہ نے خلیفہ الطائع کو معزول کر دیا، لیکن بغداد میں دس ہزار کتابوں کا ایک کتب خانہ قائم کیا۔ المعری نے اسی کتب خانے سے بہت استفادہ کیا۔ بویہ سلاطین ہی کے زمانہ میں اخوان الصفا کی جماعت قائم ہوئی

سلجوقی دور سلجوق سپہ سالار طغرل بیگ سنہ ۱۰۵۵ء میں بغداد میں داخل ہو کر بویہ کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔ خلیفہ القائم نے اس کا خیر مقدم کیا اور اس کو سلطان کا لقب عطا کیا۔ سلجوق اوغز ترکمانوں کی ایک شاخ تھی۔ اس خاندان کے تین بادشاہ بڑے نامور گذرے ہیں طغرل سنہ ۱۰۳۷ء سے سنہ ۱۰۶۳ء تک الپ ارسلان اس کے بعد سے سنہ ۱۰۷۲ء تک اور جلال الدین ملک شاہ اس تاریخ کے بعد سے سنہ ۱۰۹۲ء تک حکمراں رہے

الپ ارسلان کے زمانہ میں ملازگرد (شمالی بحیرہ وین) کی جنگ سنہ ۱۰۷۱ء قابل یادگار ہے جس میں شہنشاہ روم (بائزنٹیم) رومانس ڈیوجینیز (Romanus Diogenes) معہ اپنی فوج کے اسیر کر لیا گیا اور خراج ادا کر کے آزادی حاصل کر سکا۔ سلجوقیوں ہی کے زمانہ میں ایشیائے کوچک ترکی سانچے میں ڈھالا گیا۔ سلیمان بن قطلمش نے جو الپ ارسلان کا ایک رشتہ کا بھائی تھا روم کے سلجوقوں کی ایک بادشاہت قائم کی۔ پہلے اس کا دارالخلافہ نیقیہ (ترکی ازنیق) (Nicaea) تھا اس کے بعد قونیہ ہوا۔ اس کا بیٹا قلیج ارسلان صلیبی جنگجویوں کو ملک سے باہر نکال پھینکا۔ شام کی سلجوقی حکومت کا بانی الپ ارسلان کا بیٹا تتش تھا جو سنہ ۱۰۹۴ء سے سنہ ۱۱۱۶ء تک حکمران رہا۔ اس نے بھی صلیبی جنگجویوں کی سخت مدافعت کی۔ اس سے پہلے الپ ارسلان سنہ ۱۰۷۰ء سے حلب پر قابض رہا۔ فاطمیوں کی قوت کو بڑھنے نہ دیا اور حجاز کو ان سے چھین کر بنی عباسیہ خلفاء کی سیادت میں منتقل کیا۔ ملک شاہ کے عہد میں سلجوقیوں کو انتہائی عروج ہوا۔ یروشلم سے کاشغر تک اور قسطنطنیہ سے بحیرہ کیسپین تک ممالک ان کے قبضہ میں آئے۔ انہی کے وزیر نظام الملک مصنف سیاست نامہ نے انتظام سلطنت میں اس کی بڑی خدمت کی۔ بغداد کا مدرسہ نظامیہ اسی کا قائم کیا ہوا تھا (سنہ ۱۰۶۵ء یا سنہ ۱۰۶۷ء) جس میں ابن الجوزی اور الغزالی جیسے علما درس دیا کرتے تھے۔

اسلام میں صوفیانہ رنگ سلجوقیوں سے پیدا ہوا۔ فتوہ اور اخی اور خانقاہ اور تکیے انہوں ہی نے قائم کئے۔ دو سر والا عقاب جو کئی ہزار برس پہلے (ہٹائیت) قوم کا امتیازی نشان تھا سلجوقیوں نے اختیار کیا۔ ان سے یہ نشان بائزنٹیم والوں نے لیا اور پھر آسٹریا، پرشیا اور روس کے بادشاہوں نے۔ سلجوق بنی عباسیہ پر اپنا

اثر سنہ ۱۱۹۴ء اور عہد خلیفہ الناصر تک جاری رکھے۔ صلیبی جنگجو سنہ ۱۱۹۶ء سے ۱۲۲۵ء تک مسلمان ریاستوں پر فتح پاتے چلے گئے۔ ادھر الناصر نے خوارزم کے حاکم تکش کو اشارہ کرکے عراقی سلجوقیوں کے آخری سلطان طغرل کو شکست دلائی لیکن سلجوقیوں سے نکل کر الناصر خوارزمیوں کا دست نگر بن گیا۔

سلطان علاء الدین محمد خوارزم شاہ نے سنہ ۱۲۱۱ء میں ایران کا بیشتر حصہ فتح کر لیا اور چاہتا تھا کہ بنی عباس کو خلافت سے علیحدہ کرکے شیعی علوی خلافت قائم کرے لیکن الناصر نے چنگیز خاں کو اس سے لڑوا دیا (سنہ ۱۱۵۵ء - قریب سنہ ۱۲۲۷ء) اس نے سنہ ۱۲۲۰ء میں علاء الدین محمد خوارزم شاہ کو شکست دے کر اس کے تمام ممالک پر قبضہ کر لیا۔ علاء الدین نے بھاگ کر بحیرہ کیسپین کے ایک جزیرہ میں پناہ لی اور وہیں مر گیا۔ اس نے اس سے پہلے غزنویوں سے بھی ان کا ملک چھینا تھا اور کاشغر افغانستان بلوچستان ایران و عراق سب اس کے زیر نگیں تھے لیکن تاتاریوں نے ان تمام ممالک کے شہروں کو تباہ کر دیا۔ ہرات کی آبادی ایک لاکھ تھی مگر صرف چالیس ہزار ہی رہ گئی۔ خوارزم، بلخ، سمرقند بخارا وغیرہ ہمیشہ کے لئے اجڑ گئے۔ ابن الاثیر اس عالمگیر تباہی کے دوران میں زندہ تھا۔ چشم دید واقعات قلمبند کرتے ہوئے روتا ہے کہ بہتر ہوتا اس کی ماں اس کو جنتی نہیں تاکہ یہ بربادی دیکھنے میں نہ آتی۔ بنی عباس کے آخری دور میں نہ صرف حشیشیں، قرامطہ اور اسمٰعیلی فرقوں نے بغاوتیں کیں بلکہ آفات سماوی سے بھی ان کو دوچار ہونا پڑا۔ طاعون، چیچک زہریلے بخاروں سے ملک بہ تنگ آ گیا تھا۔ بالآخر ہلاکو نے سنہ ۱۲۵۸ء میں بغداد پر چڑھائی کرکے اس کو مسمار کر دیا اور خلیفہ المستعصم اور اس کے خاندان کو تہ تیغ کیا۔ لاکھوں مسلمان مارے گئے اور بیش بہا علمی خزانے جلا دیئے گئے ہلاکو پہلا ایلخان تھا اور سنہ ۱۲۶۵ء میں فوت ہوا۔ ساتواں ایلخان غازان محمد مسلمان

ہوا (سنہ ۱۲۹۵ سنہ ۱۳۱۶) تا تاریوں کو مائل بہ اسلام کرنے اور ایلخانوں کو مہذب حکومت کا راغب بنانے میں علاء الدین الجوینی (وفات سنہ ۱۲۸۳) اور رشید الدین مورخ (وفات سنہ ۱۳۱۸) نے انتہائی خدمت کی۔ ایلخانیوں کی ۷۵ برس تک ایران میں حکومت رہی اس زمانہ میں ایرانی ادب اور زبان کو بہت فروغ ہوا۔

سقوط بغداد کے بعد ایک دوسری ترکی قوم مشرف باسلام ہو کر دنیا میں ابھر کر مسلمان حکمرانی قائم کی یہ عثمانی ترک ہیں سلطان سلیم نے مملوک سلاطین کو سنہ ۱۵۱۷ میں آخری شکست دے کر مصر کو اپنا ایک صوبہ بنا لیا۔ اس کے بیٹے سلیمان (سنہ ۱۵۲۰ سنہ ۱۵۶۶) نے بغداد سے کر بوداپسٹ تک اور دریائے نیل کے پہلے آبشار سے آبنائے جبل الطارق تک سلطنت قائم کی۔

زوال بنی عباس کے دوران میں مغرب میں چھوٹی ریاستوں کا عروج

حضرت حسنؓ کے پڑپوتے ادریس بن عبداللہ نے ۱۸۸ھ میں **ادریسی خاندان** بھاگ کر المغرب (مراکش) میں سلطنت قائم کی جو سنہ ۷۸۸ء سے سنہ ۹۷۴ تک (تقریباً دو سو برس) برقرار رہی۔ پہلے فاس پایۂ تخت تھا اور بربروں کی مدد تھی پھر مصری فاطمیوں اور ہسپانی بنی امیہ کے سلاطین نے اس مملکت کو فتح کرنا شروع کیا بالآخر خلیفہ حکم ثانی (سنہ ۹۶۱ سنہ ۹۷۶) کے ایک سپہ سالار نے اس خاندان سے افریقہ المغرب کو پورا فتح کر لیا اور یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

اغلبیہ خاندان خلیفہ ہارون الرشید نے افریقیہ (تونس) پر سنہ ۸۰۰ء میں ابراہیم ابن الاغلب کو حاکم مقرر کیا۔ اس نے گیارہ سال حکومت کی۔ قیروان کو دار الخلافہ بنا کر خود مختار ہو بیٹھا۔ اغلبیوں کا یہ سلسلہ سنہ ۹۰۹ تک جاری رہا ان کی بحری طاقت سید پر نہیں تھی سب پر غالب تھی

اطالیہ، فرانس، کورسیکا اور سارڈینیا پر حملے ہوا کرتے تھے اور مال غنیمت اور قیدی فراہم کئے جاتے تھے زیادت اللہ اول (۸۱۶ء۔۸۳۸ء) نے ۸۲۷ء میں صقلیہ پر بحری فوج بھیج کر چڑھائی کی یہ جزیرہ اس وقت بازنطیم کے علاقہ میں تھا۔ ۸۳۱ء میں بلرم (Palermo) فتح ہو چکا تھا ۸۴۳ء میں مسینا (Messina) اگٹا ۸۵۹ء میں اور ۸۷۸ء میں سارا کوس فتح ہوا اور بالآخر ۹۰۲ء میں ٹورمینا کے ساتھ پورا جزیرہ اغلبیوں کے قبضہ میں آگیا۔ انہوں نے ایطالیہ کے جنوبی علاقہ میں باری کو ۸۴۱ء میں فتح کیا اور ٹارنٹو کو بھی۔ روما پر ۸۴۶ء میں چڑھائی کی گئی بعد کو فاطمی بحری بیڑے نے ۹۳۴ء یا ۹۳۵ء میں جنوا (Genoa) کو لوٹا لیا۔ سارڈینیا اور کریٹ کے جزائر بھی مسلم فرمانروائوں کے قبضہ میں آگئے۔ یونان پر بھی حملے ہوئے چنانچہ ایتھنز میں بعض مقامات پر کوفی خط میں اب بھی عربی عبارتیں موجود ہیں۔ دسویں صدی تک عرب ان مقاموں پر مسلط رہے۔ زیادت اللہ نے القیروان کی مسجد ثانی شروع کی جو ابراہیم ثانی (۸۷۴ء۔۹۰۲ء) کے عہد میں ختم ہوئی۔ اغلبیوں ہی نے لاطینی زبان بولنے والے شمالی افریقہ کے عیسائیوں کو عربی بولنے والے مسلمانوں میں بدل ڈالا۔

[اغلبیوں کا ایک بحری بیڑہ روم پر جب حملہ کر رہا تھا تو سینٹ پیٹر اور سینٹ پال کی گرجاؤں میں نوٹ مار مچی اور پاپائے اعظم جان ہشتم کو (۸۷۲ء۔۸۸۲ء) دو سال تک خراج دینے پر مجبور کیا]

اغلبیوں کا آخری بادشاہ زیادت اللہ سوم (۹۰۳ء۔۹۰۹ء) فاطمیوں سے شکست کھا کر بھاگ گیا اس کے ساتھ ساتھ فاطمیوں نے اخشیدیوں کو مصر اور شامی شام سے ۹۶۹ء میں نکال ڈالا۔

طولونی خاندان اس مملکت کو دولت سے مخاطب کیا جاتا ہے کیونکہ اسلا

اصول خلافت سے اس کے اصول حکومت بالکل مختلف تھے یہ خاندان ۸۶۸ء سے ۹۰۵ء تک حکومت کرسکا۔ فرغانہ کے ایک ترک کا بیٹا احمد بن طولون اس کا بانی تھا۔ ابتداً وہ مصر کے حاکم کا نائب تھا۔ ۸۶۹ء میں مصر جا کر اس نے بہت سے رفاہی کام کئے۔ عکہ میں بحری بیڑے کے لئے گودی تیار کی اور خود مختار بن بیٹھا دریائے نیل کی آب رسانی کو ترقی دی۔ قاہرہ کے قریب جزیرۃ الروضہ کے نیل پیما کی مرمت کرکے ملک کو دولتمند بنایا۔ مصر کے علاوہ شام پر بھی وہ حکمران رہا اور مصر کی صناعی کو فروغ دیا۔ ساٹھ ہزار دینار کے صرف سے ایک بیمارستان قائم کیا۔ اس کی تعمیر کردہ مسجد معنونہ اس کے نام سے مشہور ہے

اس کا مسرف بیٹا خمارویہ ایک عالیشان بادشاہی محل تیار کردیا جس میں جابجا مورتیں بنائی گئیں۔ پرندوں اور جنگلی جانوروں کے لئے ایک چڑیا خانہ اور زو (zoo) قائم کیا اور پارے سے بھرا ہوا ایک بڑا حوض بھی۔ خلیفۃ المعتضد کی اپنی لڑکی قطر الندیٰ (قطرہ شبنم) سے شادی کرائی بعد کو بے طرح قتل ہوا۔ کل پانچ طولونی امیر حکمران ہوئے جن میں سب سے آخری شیبان تھا ۹۰۵ء اس کے بعد مصر پھر بنی عباسیہ کے قبضہ میں کچھ مدت کے لئے آگیا۔

اخشیدی خاندان کا بانی فرغانہ کا محمد بن طغج تھا۔ اس خاندان نے ۹۳۵ء سے ۹۶۹ء تک حکومت کی۔ اخشید قدیم ایرانی شہزادوں کا خطاب تھا محمد الاخشید کے دو بیٹے جو اس کے بعد دیگرے تخت پر بیٹھے برائے نام بادشاہ تھے اصل حکمران ابو المسک کافور ایک حبشی خواجہ سرا تھا جس نے مصر اور شام کی حمدانی حملہ آوروں کی بڑھتی طاقت کے مقابلہ میں کامیابی کے ساتھ حفاظت کی۔ المتنبی سیف الدولہ الحمدانی کے مداح نے اپنے قصیدوں میں پہلے کافور کی ستائش کی اور پھر ہجو لکھی۔ اخشیدی خاندان کا آخری امیر گیارہ برس کا لڑکا تھا جس نے

فاطمی سپہ سالار جوہر نے ۹۶۹ء میں ملک چھین لیا۔

حمدانی خاندان (شیعہ) ابتداءً شمالی عراق میں حکمران ہوئے ان کا دارالحکومت الموصل ۹۲۹ء سے ۹۹۱ء تک رہا۔ یہ لوگ حمدان بن حمدون قبیلہ تغلب کی اولاد سے تھے۔ خاندان کا بانی سیف الدولہ تھا (۹۴۴ء۔ ۹۶۷ء) جس نے اخشید کے الب سے حلب اور حمص چھین لیا وہ علم کا بڑا سرپرست تھا اس کے دربار میں حکیم الفارابی، الفریشی الاصفہانی مصنف الاغانی۔ ابن نباتہ (واعظ دربار) اور شاعر متنبی بڑی عزت حاصل کئے۔ ابوالعلا المعری بھی (۹۷۳ء۔ ۱۰۵۷ء) جو شعراء کا فیلسوف اور فیلسوفوں کا شاعر کہلاتا تھا سیف الدولہ کے دربار میں سرفراز تھا۔ المعری کی غذا اخوان الصفا اور ہندی خیالات کے زیر اثر صرف نباتات تھی۔ اللزومیات اور لزوم مالایلزم اور رسالتہ الغفران اس کی تصانیف سے ہیں۔ آخر الذکر تصنیف کا جو فتوحات پر مبنی ہے ڈانٹے کی کتاب ڈیوائن کومیڈی کی تالیف پر گہرا اثر پڑا ہے۔ سیف الدولہ کے بعد سعد الدولہ اور اس کے بعد سعید الدولہ حکمران ہوئے سعید الدولہ بائزنطین حملوں کو پہلے کامیابی کے ساتھ رد کیا آخر نیسی فورس فوکس (Nicephorus Phocas) سے شکست کھا کر ۹۶۱ء میں حلب کھو دیا۔ اس کے بعد قبرص (Cyprus) کلیشیہ، انطاکیہ بھی بائزنطیم کے ہاتھ آ گئے انطاکیہ ۹۶۹ء سے ۱۰۸۴ء تک بائزنطیم کے قبضہ میں رہا۔ فاطمیوں کی طرف سے بھی سعید الدولہ پر دباؤ پڑا آخر مجبور ہو کر اس نے ۱۰۰۳ء میں ان کی طاعت قبول کر لی۔

فاطمی خاندان تونس میں ۹۰۹ء میں قائم ہوا اس کا بانی سعید بن حسین تھا (جو غالباً اسمٰعیلی فرقہ کے بانی دوم ایرانی عبداللہ ابن میمون

کی نسل سے تھا۔ اس کے موافق شمالی افریقہ کی بربر قوم میں ابو عبد اللہ الحسین الشیعی جو صنعا کا داعی تھا پروپاگنڈہ کیا۔ اس طرح سعید ابن حسین نے اغلبیہ حکومت کو تباہ کر دیا اور انکے ملک پر بخطاب امام عبید اللہ المہدی قبضہ کر لیا اور قیروان اس کے ہاتھ آ گیا۔ مورخین مثلاً المقریزی، ابن الاثیر، ابن خلدون، ابن خلکان ابن العذاری اور السیوطی کو بنی فاطمیوں کے خاندانی سلسلہ کی حقیقت کے متعلق بہت اختلاف ہے۔

عبید اللہ المہدی نے سنہ ۹۲۰ کے قریب ابن تونس کے ساحل پر بمقام مہدیہ قیروان سے ۱۶ میل جانب جنوب مشرق سکونت اختیار کی۔ اس کا بیٹا ابو القاسم محمد القائم (سنہ ۹۳۴ ۔ سنہ ۹۴۶) جنگی بحری بیڑہ بھیج کر فرانس کے ساحل پر حملہ کیا جنیوا کو لوٹا اور جنوبی اٹلی (کیلیبریا) پر چھاپے مار کر قیدی پکڑ لائے اس سے بھی بڑا بحری بیڑہ مقس پر جو بولاق سے پہلے قاہرہ کی بندرگاہ کا کام دیتا تھا تیار کیا۔ اس بیڑہ نے میڈیٹرینین کے ساحل پر بحر الظلمات (ظلمات) تک چھاپا مارا۔ اس مہم کا سہرہ جوہر الصقلی کے سر ہے جو ہر سنہ ۹۶۹ میں فسطاطین فتحمندی کے ساتھ واپس ہونے کے بعد ہی اس کا ایک نیا حصہ تعمیر کرایا جو بعد کو قاہرہ کہلانے لگا۔ اب یہ افریقہ بھر میں سب سے زیادہ آباد شہر ہے۔ جوہر نے سنہ ۹۷۲ میں جامع ازہر تیار کروایا جس کو فاطمی خلیفہ العزیز نے جامعہ بنا دیا۔ فاطمی سلطنت تمام شمالی افریقہ مغربی عرب (جو اخشیدیوں سے چھینا گیا تھا) اور شام میں دمشق تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے بڑے دشمن قرامطہ تھے جو اس وقت شام میں بڑی قوت رکھتے تھے۔

اس خاندان کا پانچواں بادشاہ ابو منصور نزار العزیز (سنہ ۹۷۵ سنہ ۹۹۶) پہلا فاطمی تھا جو حکومت کو مصر میں منتقل کیا۔ اسی کے زمانہ میں حکومت اپنی معراج

کو پہنچ گئی۔ وہ بہت مریض اور فیاض بھی تھا۔ اس کے بعد ترکی اور حبشی فوجیں
ملازم ہونے لگیں اور سلطنت کو زوال آیا۔ ابو علی منصور الحاکم (۹۹۶ء تا ۱۰۲۱ء)
کسی قدر مجنونی تھا۔ اس نے کئی گرجائیں گرا دیں جن میں ہولی سیپلکر بھی شامل تھی
۱۰۰۹ء اور غیر مذہب والوں کو مجبور کیا کہ لباس وغیرہ ایسا پہنیں جس سے وہ
پہچانے جا سکیں (عمر ثانی اور المتوکل کے بعد یہ پہلا اس قسم کا امتیاز ہے)۔
علاوہ بریں اس نے دروزوں سے ۱۰۱۹ء میں اپنی پرستش کرائی۔ شیخ کی آخر
شاید خود اسی کی بہن ست الملوک کو بدنام کرنے کی پاداش میں سازش ہو کر
مقطم پر قتل کر دیا گیا (فروری ۱۰۲۱ء) اس کے بیٹے اور جانشین الظاہر نے
ہولی سیپلکر کی از سر نو تعمیر کرائی جس کے معاوضہ میں کانسٹنٹائن ہشتم نے بازنطیم
اور یروشلم کی مسجدوں میں اس کے نام کا خطبہ پڑھنے کی اجازت دی۔
اس کے بعد سلطنت کا شیرازہ بکھر گیا۔ فرنگی فوجوں نے ۱۰۷۱ء
میں صقلیہ چھین لیا فلسطین میں اکثر بغاوت ہونے لگی بساسیری جو سالار افواج
بنی عباسیہ نے اپنے خلیفہ کے ساتھ نمک حرامی کی۔ خلیفہ القائم مجبور ہو کر
فاطمیوں کے مفاد میں اپنے حقوق خلافت اور حلۂ مبارک امعہ دربچہ وغیرہ
سے دست بردار ہو گیا بعد کو آنے والے فاطمیوں کے دور میں درباری سازشیں
بہت پھیل گئیں۔ اسامہ کے بیانات سے جو فاطمی سلاطین کے دربار میں ۱۱۴۴ء
سے ۱۱۵۴ء تک تھا ان سازشوں کا بخوبی پتہ چلتا ہے۔ آخر کار سلطان صلاح الدین
نے ان سب کو فاطمی سلطنت کے ساتھ ختم کر دیا (۱۱۷۱ء)
(الحاکم باوجود تعصب اور دیگر کمزوریوں کے علم و حکمت کا ہوا خواہ تھا
۱۰۰۵ء میں دار الحکمہ قائم کیا اور المقطم پر رصدگاہ تعمیر کرائی۔ علی ابن یونس
سال وفات ۱۰۰۹ء مصر کے تمام منجموں سے (بشمول بطلیموس) بڑا ماہر ہیئت

تھا علی الحسن بن الہیثم (ولادت بصرہ میں ۹۶۵ء وفات ۱۰۳۹ء) مسلمانوں میں
سب سے بڑا محقق طبیعیات پیدا ہوا۔ ریاضی ہیئت الافلاک اور طب
لسانیات وغیرہ پر اس کی کوئی ایک سو تصانیف مذکور ہیں (بحوالہ ابن ابی اصیبعہ
وقفطی) عمار علی الموصلی نے المنتخب فی علاج العین لکھی جو ابن عیسیٰ کے تذکرہ
سے زیادہ جدت رکھتی ہے لیکن کم جامع ہے۔ اس میں نرم ہوئے کو نلکی
کے ذریعہ کھینچ کر نکالنے کا علاج بھی درج ہے کہتے ہیں کہ الحاکم کے شاہی کتب خانے
میں دو لاکھ سے زاید کتابیں تھیں۔

جامع الازہر جو ۹۷۲ء میں جوہر کی تعمیر ہے ہندسی نقطہ نظر سے بہت خوبصورت
بنا ہے اس کے وسیع دروازے بہت شاندار ہیں قاہرہ کے عجائب خانہ میں
عربوں کے اس زمانہ کے صناعی نمونے لکڑی اور برنجی سامان کی دستکاری
ظروف آبگینہ سے اور چینی کے برتن وغیرہ فراہم ہیں۔ اولاً مقریزی نے ان کو روشناس
کرایا۔

(۹۴۸ء میں فاطمی سلطان المنصور نے الحسن ابن علی بن ابی الحسین الکلبی
کو صقلیہ کا حاکم مقرر کیا۔ ابو الفتوح یوسف بن عبد اللہ کے دور (۹۸۹ء۔
۹۹۸ء) میں مسلمانوں کو یہاں کا عروج نصیب ہوا ابن حوقل کے سفر پلرم
کے حالات سے پتہ چلتا ہے کہ ملک کس قدر خوشحال تھا۔ نارمن فتح کے
بعد مسلمانوں کا علم وفضل اور ان کی صناعی ہی ان کی قدر کا باعث رہی یہ دور
بھی جلد گذر گیا)

(روجر ثانی کے عہد کا سب سے پہلا جو سکہ عربی حروف کا جاری ہوا ہے اس
پر عربی عبارت سکے کے ساتھ ۱۱۳۸ء درج ہے۔ روجر ثانی خود بھی اسلامی لباس
پہنتا تھا اس کے پوتے ولیم ثانی (۱۱۶۶ء۔ ۱۱۸۹ء) کے عہد میں ابن جبیر نے

صقلیہ (پلرم) میں عیسائی عورتوں کو اسلامی لباس پہنتے دیکھا ہے۔ الادریسی نے فریڈرک ثانی کی درباری ملازمت کے دوران میں اپنی مشہور کتاب نزہت المشتاق فی اختراق الآفاق تصنیف کی۔ اس بادشاہ نے مسلمانوں کی ایک نوآبادی کو گرگنٹی سے لونیرا (Lucera) میں منتقل کیا۔ مائیکل اسکاٹ عربی داں اس کے دربار میں عربی کتب کے ترجمہ پر مامور تھا۔ عربی زبان میں ایک تحریر پر ۱۲۰۹ء تاریخ درج ہے۔ دمشق کے بادشاہ الاشرف نے فریڈرک کے پاس ایک پلانیٹیریم بھیجا جس میں سورج اور چاند کی گردشوں کے ذریعہ وقت بتایا جاتا تھا اس نے ریاضی اور ہیئت الافلاک کے مسائل اور نیز فلسفہ مذہب کے سوالات مسلم حکمار کمال الدین ابن یونس اور اسپین کے ابن سبعین کے پاس حل کے لئے بھیجے اور نیپلز کی جامعہ قائم کی۔

مسلمانوں کے جغرافی تحقیقات

شہنشاہ چین Tai Tsung ٹے سونگ کے دربار میں عرب تاجروں کا ایک وفد جو ۶۲۸ء میں آیا تھا (نسطوریوں سے تین برس پہلے) اس کا خیر مقدم کیا گیا اور عرب تجار کی عبادت کے لئے کینٹن (Canton) میں ایک مسجد بنانے کے لئے امداد دی گئی۔ ابن وہب نے ۸۷۰ء میں چین کا سفر کیا الف لیلہ کے بعض قصے اس کے خوشہ چین ہیں۔

سامانی دربار میں ابوزید البلخی (وفات ۹۳۴ء) نے مسالک الممالک شروع کی اور الاصطخری نے ۹۵۰ء کے قریب میں اس کی تکمیل کی۔ دنیا کے راستوں کا پہلا ذکر المسعودی نے کیا۔ پھر ابن حوقل نے المسالک و الممالک میں دوران ۹۴۳ء و ۹۷۰ء میں اس میں اضافہ کیا۔ المقدسی نے اپنے بیس سفروں کے حاصل موجودہ تمام ممالک اسلام میں الا ہند، سیستان اور اسپین کے

انجام پائے تھے تاریخ تصنیف (۳۷۵ھ یا ۹۸۶ء) احسن التقاسیم فی معرفۃ الاقالیم بھی تصنیف کیا۔ احمد ہمدانی نے الاکلیل لکھی اور نیز صفات جزیرۃ العرب۔ اس کا انتقال صنعا کے قید خانہ میں ۹۴۵ء میں واقع ہوا۔ اخوان الصفا کی تصانیف میں بھی قیمتی جغرافی معلومات شامل ہیں ان میں بتایا گیا ہے کہ مزروعہ علاقے کیسے صحرا بن گئے اور گھاس کے وسیع میدان (Steppes) سمندر میں اور سمندر سے میدانوں میں تبدیل ہو گئے۔

یاقوت بن عبداللہ الحموی (۱۱۷۹ء۔۱۲۲۹ء) کا شاہکار معجم البلدان ایک جغرافی لغت ہے)

اخلاقیات وغیرہ پر مسلمانوں کے تصانیف

ابن المقفع (سنہ جو ۷۵۷ء میں قتل کیا گیا) الادب الیتیمہ تصنیف کی حنین بن اسحق نے بھی علم الاخلاق پر قلم اٹھایا۔ مسکویہ جو بویہ سلاطین معزالدولہ رکن الدولہ اور عضد الدولہ کا خازن اور دوسرے ممتاز عہدوں پر مامور تھا تہذیب الاخلاق لکھی الغزالی کا شاہکار اس شعبہ میں مشہور ہے جس کا طرز صوفیانہ ہے الماوردی جو بغداد کا قانون داں حکیم تھا اور ۱۰۵۸ء میں فوت ہوا ادب الدنیا والدین سیاسیات وغیرہ پر لکھی بعد کو النسفی (وفات ۱۱۴۲ء) نے بھی قانون و سیاسیات کے نظریہ پر کتاب لکھی)

حیاتیات سے متعلق اسلامی تصانیف

النظام (وفات ۸۴۵ء) معتزلہ کے نظریہ ارتقا کہ حضرت آدم اور ان کی اولاد گو سب ایک ہی وقت میں پیدا کئے گئے تقدیر کے بموجب اپنے اپنے وقتوں میں یکے بعد دیگرے دنیا میں آتے اور چلے جاتے ہیں (نظریہ تخلیق یا تکوین بالقوہ) کا موجد ہے ابو عثمان عمرو ابن بحر الجاحظ (وفات ۸۶۸ء یا ۶۹) ساکن بصرہ نے کتاب الحیوان (لکھی) جانوروں کی کشمکش حیات پر بحث کی ہے۔ اس کو جانوروں کے ہوا سے خشک گھونسلے کے ذریعہ اونچا بنانا آتا تھا۔ الدمیری مصری (وفات ۱۴۰۵ء) جس کی کتاب حیات الحیوان کا

جیاکر (A. S. G. Jayakar) نے انگریزی میں ترجمہ کیا عربوں کا سب سے بڑا حیوانیات کا مصنف تھا (ابو العباس الفضل ابن سالم النیریزی مہندس (وفات تقریباً سنہ ۹۲۲) نے المعتضد کے لئے جویات یعنی کرہ ہوائی کے مظاہر پر ایک کتاب لکھی الدینوری نے نباتات پر۔ اسی طرح البیرونی اور ابن سینا نے بھی باوجود دوسرے مضامین کے ماہر ہونے کے نباتیات سے دلچسپی ظاہر کی ہے چنانچہ ابن سینا نے سمندر کے ہٹنے اور بڑھنے اور خشکی کے حصوں کو رگڑ کر مٹا دینے اور پہاڑوں وغیرہ کے پیدا ہونے پر بحث کی ہے۔ اسپین (اشبیلیہ) کا ابو العباس النباتی تلاش نباتات میں اسپین، افریقہ کا ساحل، عرب اور بحر قلزم تک چھانتا پھرا۔ ابن بیطار (ملاغہ Malaga) کا دمشق اور لبنان کے پہاڑوں میں نباتات ڈھونڈتا پھرا۔ بغداد کے انجوالعی نے بارہویں صدی کے پہلے نصف میں اور مصر کے عبدالمومن نے تیرھویں صدی کے دوسرے نصف میں گھوڑوں پر کتابیں لکھیں میکانی زراعت خصوصاً دجلہ کے بارانی حصہ کی آب کشی (hydraulics) کے کاموں پر اسمٰعیل ابن الرزاق نے کتاب لکھی۔ مصر کے انجنیر قیصر ابن تعاسیف (وفات سنہ ۱۲۵۱) نے شام کی پن چکیوں کو ترقی دی۔ جنگ کی صنعتوں کو مسلمانوں نے بہت فروغ دیا۔ چنانچہ سنہ ۱۳۰۰ سے پہلے حسن الرماح (نجم الدین الاحدب) نے اس مضمون پر دو کتابیں لکھی ہیں جن میں الفروسیہ والمناصب والحربیہ مشہور ہے محمد ابن شاذان سہل ابن ربان لیث ابن کہلان کو جو غالباً بارھویں صدی کے پہلے نصف میں زندہ تھے احمد بن ماجد نے سمندر کے تین شیر شرزہ اور اپنے آپ کو چوتھا بتایا ہے۔ ابن وحشیہ نے بھی نباتیات اور کیمیا پر کام کیا۔

گرامر ولسانیات وغیرہ خلیل ابن احمد عام طور پر عربی پراسوڈی یعنے علم عروض کا موجد خیال کیا جاتا ہے جمال الدین ابو عمر عثمان ابن عمر ابن الحاجب نے

ولادت سنہ ۱۱۷۵ اور وفات اسکندریہ میں سنہ ۱۲۴۹ الکافیہ اور الشافیہ عربی گرامر پر مختصر کتابیں لکھیں نیز علم العروض پر کتاب المقصد الجلیل فی علم الخلیل لکھی۔ خلیل بن احمد عمان میں پیدا ہوا بصرہ میں نشو و نما پایا اور ۷۴ برس کی عمر پاکر بصرہ میں سنہ ۷۹۱ یا ۷۹۲ میں مر گیا اپنی تصنیف موسوم بہ الکتاب میں اس نے عربی گرامر کو باقاعدہ بنایا۔ سب سے پہلی عربی لغت لکھنے کی کوشش کی کتاب العین کتاب الایقاع (Rhythm سے پر کتاب لکھی۔ ابو الحسن علی بن اسمعیل الاشعری ولادت بصرہ میں سنہ ۸۷۳ یا ۸۷۴ وفات بغداد میں سنہ ۹۳۵ یا ۹۳۶ مسلم اسکولاسٹزم کا بانی ہے۔ کمال الدین ابو البرکات عبد الرحمٰن بن ابی الوفا محمد بن عبید اللہ ابن ابی سعید بن الانباری ولادت سنہ ۱۱۱۹ استاد مدرسہ نظامیہ عربی ادب اور لسانیات کی تاریخ موسوم کتاب نزہۃ الالبا فی طبقات الادبا لکھی۔

جار اللہ ابو القاسم محمود بن عمر الزمخشری ولادت سنہ ۱۰۷۵ وفات سنہ ۱۱۴۳ گرامر پر کتاب المفصل اور علم لغت پر کتاب المقدمۃ الادب لکھی جغرافیہ پر بھی کتاب الامکنہ والجبال والمیاہ تصنیف کی۔

ابو یعقوب یوسف بن ابی بکر ابن محمد سراج الدین السکاکی ولادت سنہ ۱۱۶۰ وفات سنہ ۱۲۲۸ یا ۲۹ ترک عربی میں معانی و بیان (Rhetoric and grammar اور صرف و نحو (Phonology and morphology پر کتابیں تصنیف کیں بربنسل کا شرف الدین محمد البوصیری سنہ ۱۲۱۳ قریب سنہ ۱۲۹۶ کے قصیدہ بردہ کی (۹۰) شرحیں ترکی۔ عربی۔ ایرانی بربری زبانوں میں لکھی گئی ہیں۔ اس قصیدہ کے ایرانی۔ ترکی۔ جرمنی۔ فرانسیسی انگریزی اور اطالوی زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں انگریزی ترجمہ جے ڈبلیو رڈ ہاؤس نے ڈبلیو اے کلاؤسٹن کی عربی نظم برائے انگریزی قارئین" J. W. Redhouse in W. A. Clouston's Arabic Poetry for English Readers گلاسگو سنہ ۱۸۸۱

میں شائع کیا ہے۔

[مراکش کے شریف شمالی افریقہ کے سلطان سنہ ۱۵۲۲ء سے حکومت کرنے لگے۔ یہ حضرت حسنؓ کی اولاد سے ہیں ان کے عقاید اہل سنت والجماعت کے عقائد کے قریب قریب ہی ہیں۔]

محمد عبدالرحمن خاں



کائنات کا ارتقاء

ہر روز تو ہم یہ سنتے اور پڑھتے ہی رہتے ہیں کہ روس میں کیا ہو رہا ہے، جرمنی کا کیا حال ہے، امریکہ کیا کہہ رہا ہے اور جاپان کیا کر رہا ہے۔ آئیے آج تھوڑی دیر کے لئے اپنی نظر کو وسیع کریں اور زمین کے ان ہنگاموں سے دور ہٹ کر کائنات کی ماہیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ طبیعی دنیا کے اس سب سے زیادہ وسیع موضوع پر بحث کرتے ہوئے مجھے یہ ڈر ہوتا ہے کہ کہیں آپ وہی اعتراض نہ کر بیٹھیں جو شاعر نے کئی سو سال قبل کیا تھا یعنی یہ پوچھیں کہ "تو کار زمیں را نکو ساختی، کہ با آسمان نیز پرداختی" لیکن انسان کا تخیل ہی آفاق گیر ہوتا ہے اور اس کی نظر آن سوئے افلاک رہتی ہے اس کے علاوہ انسان کو اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ ہے اور وہ یہی سمجھتا ہے کہ یہ ساری کائنات اسی کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ سات آسمان، رات دن اسی لئے گردش میں ہیں کہ انسان کے لئے کچھ نہ کچھ کر جائیں۔ ہوا، پانی، چاند سورج اور ستارے اس طریقے کے مطابق جو ان کے لئے مقرر کر دیا گیا ہے حضرت انسان کی خدمت بجا لا رہے ہیں۔

ہر شخص اپنی ساری جائداد کا کبھی نہ کبھی جائزہ لیتا ہے [illegible]

اپنی اس وسیع ملکیت کا کچھ جائزہ لیں۔ اس ایک تقریر میں تمام تفصیلوں سے بحث کرنے کی توقع آپ یقیناً مجھ سے نہیں رکھیں گے میں ان مختلف مباحث کا بھی تذکرہ نہیں کرونگا جو اس موضوع کے متعلق مختلف محققین کے درمیان جاری ہیں۔ یہ موضوع چونکہ ابھی تشکیل پا رہا ہے، اس لئے اس کے متعلق کوئی آخری رائے ابھی قائم نہیں ہوئی ہے البتہ ایک خاکہ بن گیا ہے جس کے متعلق علماء کا کم و بیش اتفاق ہے۔ یہی خاکہ میں آپ کے سامنے عام فہم زبان میں پیش کرنے کی کوشش کرونگا۔

ابتدائی زمانے میں انسان نے ہر واقعے کی ظاہری شکل و صورت کو ایک تدبیر مبنی قرار دیا چنانچہ زمین کو ساکن اور تمام کائنات کا مرکز مان لیا گیا کیونکہ چاند سورج اور ستارے زمین کے گرد چکر لگاتے ہوئے نظر آتے ہیں آسمان کے مختلف طبقے (سات یا نو) قرار دیے گئے ہیں جن میں مختلف اجرام فلکی جڑے ہوئے ہیں جو زمین کے گرد دائروں اور دائرہ نما شکلوں میں گردش کرتے ہیں۔ اس تصور کو یونانی حکیم بطلیموس نے باقاعدہ طور پر پیش کیا اور دوسری قوموں مثلاً ہندوستانی اور عرب قوموں میں یہ ایک عرصے تک رائج رہا۔ متاخرین عرب نے بطلیموسی نظام میں بہت سی اصلاحیں کیں اور جیسا کہ البیرونی نے تفصیل سے بیان کیا ہے، انہوں نے بتلایا کہ ہمارے نظام شمسی کا مرکز زمین نہیں بلکہ سورج ہے اور سورج کے گرد سیاروں کے مدار بیضاوی ہیں۔ ۱۵۴۳ء میں کوپرنیکس نے یورپ میں وہی نظام شمسی پیش کیا جو عربوں نے پہلے ہی دریافت کیا تھا۔ ۱۶۰۹ء میں کیپلر نے مشاہدوں کی مدد سے سیاروں کی حرکت کے اصول معلوم کئے۔ لیکن اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ یہ حرکت ہوتی کیوں ہے۔ آخر مجبور ہو کر سترھویں صدی کے اس مشہور جرمن حکیم نے مان لیا کہ ہر سیارہ

میں ایک قوت ہوتی ہے جو اس کو سورج کے گرد گھماتی ہے۔ عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ سیاروں کے متعلق قانونِ تجاذب کو سترھویں صدی میں نیوٹن نے دریافت کیا اور یہ ایک حد تک صحیح بھی ہے کہ اس قانون کو ریاضی کی زبان میں بیان کرنے اور پھر اس ریاضیاتی قاعدہ سے باضابطہ طور پر سیاروں وغیرہ کی حرکتوں کی توجیہ اور تشریح کرنے کا شرف نیوٹن ہی کو حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ عالمگیر قانونِ تجاذب کے بنیادی اصول کی جھلک مسلمانوں نے اس سے پہلے دیکھ لی تھی اور ان کا یہ خیال تھا کہ اجرام فلکی کی حرکت اس باہمی کشش اور تجاذب کی بنا پر ہوتی ہے۔ یہ خیال اس زمانے میں اس قدر وسعت حاصل کر چکا تھا کہ ادب اور شعر و سخن میں بھی اس کا تذکرہ ہونے لگا تھا۔ کسی علمی اصول کی ہمہ گیری کا اس سے بڑھ کر اور کیا معیار ہو سکتا ہے کہ وہ عوام اور شاعروں کی زبان پر چڑھ جائے۔ چنانچہ مولانا روم نے اپنی مثنوی میں ایک حکیم اور ایک عامی کے مابین مکالمہ درج کیا ہے جس میں اس عالمگیر تجاذب کی تشریح شاندار پیرائے میں کی ہے۔ فرماتے ہیں:۔

جملہ اجزائے جہاں زاں حکم پیش — جفت جفت و عاشقان جفتِ خویش
ہست ہر جزوے بعالم جفت خواہ — راست ہمچوں کہربا و برگ کاہ
آسماں گوید زمیں را مرحبا — با توام چوں آہن و آہن ربا

یعنی اس کائنات کا ہر ذرہ دوسرے ذرے کو اس طرح کھینچتا ہے جیسے کہ کہربا پتھر گھاس کے تنکوں کو کھینچتا ہے۔ آسمان اور زمین دونوں باہم لوہے اور مقناطیس کی طرح ایک دوسرے کو کھینچتے ہیں۔ پہلے دو شعروں میں قانونِ تجاذب کو تقریباً انہی الفاظ میں بیان کیا گیا ہے جن کو نیوٹن استعمال کرتا ہے لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ مثنوی ساتویں صدی میں لکھی گئی تھی اور نیوٹن کا زمانہ پانچ سو سال

معید کا ہے۔

مولانا روم پھر اس سوال کو اٹھاتے ہیں کہ یہ زمین فضائے بسیط میں کس طرح معلق ہے کہ کسی طرف نہیں گرتی اور اس کی توجیہ اسی عالمگیر تجاذب کی بنا پر کرتے ہیں:۔

"گفت سائل چوں بماند ایں خاکداں | درمیان ایں محیط آسماں
ہمچو قندیلے معلق در ہوا | نے براسفل می رود نے بر علا؟
آں حکیمش گفت کز جذب سما | از جہات شش بماند اندر ہوا
چوں زمقناطیس قبہ ریختہ | درمیاں ماند آہنے آویختہ"

عام فہم زبان میں قانون تجاذب کو اس سے زیادہ واضح طور پر بیان کرنا مشکل ہے۔ غرض قانونِ تجاذب کے اس تصور سے عرب حکما بارھویں صدی میں واقف تھے لیکن اس سے نیوٹن کی عظمت میں کوئی فرق نہیں آتا۔ سائنس میں محض کسی اصول کا تصور کر لینا اور اس کو عام زبان میں بیان کر دینا کافی نہیں ہے بلکہ اس کی باضابطہ ریاضیاتی تدوین کرنی چاہیے تاکہ اس سے واقعات کی توجیہ اور آئندہ کے متعلق پیش گوئی کی جا سکے۔ اس لحاظ سے نیوٹن کا کارنامہ دنیائے سائنس کے چوٹی کے کارناموں میں ہمیشہ شمار ہوتا رہے گا۔ تاہم اس امر کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ نیوٹن کے پیشرو کیپلر نے سیاروں کی حرکت کی توجیہ کرنے کے لئے یہ ضروری سمجھا کہ ہر سیارے میں ایک روح فرض کی جائے اس واقعے کو ملحوظ رکھ کر تو ہمیں عرب حکما کی سائنسی ذہنیت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

غرض نیوٹن کے قانونِ تجاذب اور میکانیات کو غیر معمولی کامیابی ہوئی اور اس کی بنا پر ۱۹ویں صدی میں کائنات کے متعلق بہت سے نظریے پیش کئے گئے جسم ان میں لاپلاس کا سحابی نظریہ جو اس نے کائنات کے متعلق ۱۷۹۶ء

میں پیش کیا تھا زیادہ مشہور ہے۔ چونکہ یہ تمام نظریے ناقص تھے اور اب متروک ہو چکے ہیں اس لئے ہم ان کی تفصیلات میں پڑنا نہیں چاہتے۔

۱۹ویں صدی کے آخر میں نیوٹن کی میکانیات میں خامیاں دریافت ہوئیں اور اس کی بجائے دو نظریے دریافت ہوئے جو موجودہ طبیعی سائنس کے اہم ترین اور بنیادی نظریے ہیں۔ ان کو اضافیت کا نظریہ اور کوانٹم نظریہ کہتے ہیں اور ہمارا خیال ہے کہ ان کے اساسی اصول سے سامعین کم و بیش واقف ہیں نظریہ اضافیت کے انکشاف سے پہلے مکان کے لحاظ سے کائنات بے انتہا سمجھی جاتی تھی کیونکہ فضا کے ختم ہونے کا تصور کرنا مشکل تھا۔ اگر مکان یعنے فضا کی انتہا فرض کی جائے تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انتہا پر کیا کوئی کنارہ یا دیوار واقع ہے اور چونکہ فضا کی انتہا پر کسی دیوار یا کنارے کا تصور ناممکن تھا اس لئے مان لیا گیا کہ فضا کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ لیکن نظریۂ اضافیت کی بنا پر آئن شٹائن نے نہ صرف یہ ثابت کیا کہ کائنات بے انتہا نہیں ہے بلکہ یہ بھی بتایا کہ اس متناہی کائنات کا تصور کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ تجربوں کی بنا پر اور حساب لگانے سے معلوم ہوا ہے کہ دنیا میں مادے کی بے انتہا مقدار نہیں بلکہ ایک معین مقدار پائی جاتی ہے اگر مادے کی یہ معین مقدار بے انتہا فضا میں پائی جائے تو دنیا میں مادے کی اوسط کثافت یعنی حجم کی اکائی میں نسبت کی مقدار صفر ہو جائے گی لیکن تجربوں اور نظریہ دونوں کی بنا پر یہ ماننا پڑتا ہے کہ دنیا میں مادے کی اوسط کثافت صفر نہیں ہو سکتی اس لئے بے انتہا فضا کا تصور غلط ہے۔

اب آپ کہیں گے کہ اگر فضا متناہی ہو تو پھر اس کا کنارہ کیا ہے لیکن یہ سوال آپ کے ذہن میں اس لئے آتا ہے کہ آپ نے فضا کو ایک کمرے کی طرح چپٹی یعنی اقلیدسی سمجھ رکھا ہے۔ ایک کرہ مثلاً گولے کو لے لیجئے۔ اس گولے کی

سطح بے انتہا نہیں ہے کیونکہ اس کے کسی دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ معین ہے لیکن کیا اس گولے کی سطح پر کوئی حد یا کنارہ ہے ؟ اگر زمین کی سطح پر آپ چلنے لگیں تو کیا کسی مقام پر پہنچ کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کے آگے نہیں جا سکتے ؟ پس ایک کرے کی سطح کے لئے آپ کو ماننا پڑتا ہے کہ وہ متناہی ہے لیکن اس کے کسی مقام پر کوئی حد یا کنارہ نہیں ہے۔ نظریۂ اضافیت نے بتایا ہے کہ فضا بھی چپٹی (اقلیدسی) نہیں بلکہ پیچ دار اور خمیدہ (نااقلیدسی) ہے اس لئے ایک گولے کی طرح یہ بھی متناہی ہو سکتی ہے اگرچہ کوئی حد یا کنارہ نہ ہو۔ ایسی فضا کو ریاضی داں "متناہی لیکن غیر محدود" کہتے ہیں یہ صرف ایک اصطلاح ہے اور غیر ریاضی دانوں کو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں اس کا مطلب صرف یہی ہے کہ فضا کے کسی دو نقطوں کا درمیانی فاصلہ بے انتہا نہیں بلکہ معین ہے اگرچہ اس فضا میں ہم جب تک چاہیں چل سکتے ہیں کوئی حد یا کنارہ ایسا نہیں ہے جہاں پہنچ کر ہمارا سفر ختم ہو جائے۔

صدیوں سے انسانی ذہن چپٹی اور بے انتہا فضا کے تصور سے مانوس ہے ایک ایسی فضا جس میں پیچ و خم ہو اور جو متناہی لیکن غیر محدود ہو ایک انوکھی اور اجنبی چیز معلوم ہوتی ہے۔ اس کو سمجھنے اور اس سے مانوس ہونے کے لئے ہمیں اپنے دماغ پر بار ڈالنا پڑتا ہے۔ اس مصیبت سے بچنے کے لئے ہم اس تصور ہی کو مہمل کہہ دیتے ہیں اور نظریۂ اضافیت کو غلط قرار دیتے ہیں لیکن یاد رکھنا چاہیئے کہ کائنات کے خمیدہ یعنی نااقلیدسی اور متناہی ہونے کے خلاف کوئی منطقی وجہ نہیں ہے۔ کسی نظریے کی صحت اور صداقت کا معیار اس کا مانوس یا غیر مانوس ہونا نہیں بلکہ یہ ہے کہ مشاہدات اور واقعات اس کے موافق ہیں یا نہیں۔ جتنے واقعات ہم کو اب تک معلوم ہیں وہ سب اس مفروضے

کی تصدیق کرتے ہیں کہ کائنات بے انتہا نہیں بلکہ تناہی ہے اب تک ایک واقعہ بھی ایسا نہیں معلوم ہوا جس کی بنا پر یہ کہا جا سکے کہ فضا کو بے انتہا ہونا چاہیئے ۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ کائنات کا نصف قطر تقریباً چھ ارب "نور سال" اور تیس ارب نور سال کے درمیان ہے ۔ "نور سال" فاصلے کی اکائی ہے جو فلکیات میں میلوں کی بجائے استعمال ہوتی ہے اور جو تقریباً چھ کھرب میل کے برابر ہوتی ہے ۔ یہ وسعت اگرچہ کافی زیادہ ہے لیکن پھر بھی لاتناہی کے مقابلے میں بہت حقیر ہے اور اس لئے شاعر کا یہ کہنا غلط نہیں تھا کہ ؛

"ترک دنیا کا فکر کیا ناسخ　　　کچھ بڑی ایسی کائنات نہیں"

نظریۂ اضافیت کی بنا پر کائنات کے بہت سے سکونیاتی اور حرکیاتی نمونے مختلف علما نے پیش کئے ہیں لیکن یہ ابھی معرض بحث میں ہیں اور ابھی ان کے متعلق کوئی قطعی تصفیہ نہیں ہوا اس لئے ہم ان کی تفصیل کو نظر انداز کرتے ہیں اور کائنات کی ابتدا، ارتقا اور انجام کے متعلق جدید خیالات کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ؛

ہم جانتے ہیں کہ سورج ہم سے قریب ترین ستارہ ہے ۔ ستاروں کے مختلف نظام ہوتے ہیں جن میں سے ہر نظام میں تقریباً ایک کھرب ستارے ہوتے ہیں ۔ یہ ستارے ایک خاص رشتے کے تحت جکڑے ہوئے ہوتے ہیں اور علم فلکیات میں جب کائنات کے ارتقا سے بحث ہوتی ہے تو ستاروں کے اس نظام کو اکائی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے ایسے نظام کو "سحاب" (نیبولا) کہتے ہیں اور اندازہ کیا گیا ہے کہ اس طرح کے تقریباً دو کروڑ سحاب پائے جاتے ہیں ہمارا سورج جس سحاب میں واقع ہے اس کو کہکشاں کہتے ہیں یہ ایک

بعید ترین اجرام فلکی ہیں جو ہم کو دکھائی دیتے ہیں۔ ان کے فاصلے دس لاکھ نور سال سو پندرہ کروڑ نور سال تک ناپے گئے ہیں۔

نظریہ اضافیت کی بنا پر ہالینڈ کے ریاضی داں ڈے سٹر نے ۱۹۱۷ء میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تمام سحاب ایک دوسرے سے دور ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک عرصے تک اس کا ثبوت مشاہدے سے حاصل کرنا دشوار تھا لیکن آخر ونڈ ماؤنٹ ولسن کی ایک سو انچ والی دوربین سے اس کا ثبوت مل ہی گیا۔ ان مشاہدوں سے پتہ چلتا ہے کہ مختلف سحاب ہم سے دور ہوتے جا رہے ہیں اور ان کی رفتاریں فاصلوں کے ساتھ بڑھتی جاتی ہیں مختلف سحابوں کی رفتاریں چھ میل فی ثانیہ سے لے کر پچیس ہزار میل فی ثانیہ تک ناپی گئی ہیں۔

سحابوں کے ایک دوسرے سے ہٹنے کی توجیہ نظریہ اضافیت کی بنا پر کی جاتی ہے۔ ۱۹۱۵ء میں آئن شٹائن نے نیوٹن کے قانون تجاذب کی بجائے ایک نیا قانون پیش کیا جو زیادہ صحیح ہے۔ اس قانون کو ریاضی کی زبان میں فضا کے پیچ وخم اور اس کے نصف قطر کی رقوم میں بیان کیا جاتا ہے لیکن عوام کو سمجھانے کے لئے ہم اس کو قوتوں کے مفہوم میں بھی بیان کر سکتے ہیں اگرچہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ آئن شٹائن نے قوت کے مفہوم کو ساقط کر دیا ہے آئن شٹائن کا نیا قانون یہ بیان کرتا ہے کہ ہر دو مادی جسموں کے درمیان نہ صرف ایک تجاذبی کشش پائی جاتی ہے جیسا کہ نیوٹن نے فرض کیا تھا بلکہ ان دونوں میں ایک قسم کی مدافعت یا ڈھکیلنے کا میلان بھی ہے جس کے باعث وہ ایک دوسرے سے دور ہونا چاہتے ہیں مدافعت کی یہ قوت فاصلے کے تناسب سے ہے یعنی فاصلے کے بڑھنے پر بڑھتی ہے اور فاصلے کے گھٹنے پر گھٹتی جاتی ہے۔ ایک ہی سحاب کے اندر مختلف جسموں

میں کشش کی قوت زیادہ اور مدافعت بہت ہی کم ہے اس لئے ایک سحاب کے اندرونی جسموں کے درمیانی فاصلوں میں مقابلۃً بہت کم فرق پیدا ہوتا ہے لیکن جوں جوں فاصلے بڑھتے جاتے ہیں کشش کی قوت کم اور مدافعت کی قوت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ سحابوں کا ایک دوسرے سے دور ہوتے جانا اسی مدافعت کی قوت کا نتیجہ ہے یہ سحاب ہم سے اس طرح دور ہو رہے ہیں کہ ایک ارب تیس کروڑ سال کے بعد ان کا فاصلہ دگنا ہو جاتا ہے کائنات کے ارتقا میں ایک ارب تیس کروڑ سال ایک معمولی بات ہے جو زمین کے قدیم ترین پہاڑوں کی عمر سے کچھ زیادہ نہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کائنات کی فضا بے انتہا نہیں بلکہ متناہی ہے۔ جس کو تشبیہاً ایک گول کرے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے ہم صرف وضاحت کی خاطر یہ مان لیتے ہیں کہ کائنات ایک غبارے کی طرح ہے جس کی سطح پر مختلف سحاب جمے ہوئے ہیں جیسا کہ ہم نے ابھی دیکھا ہے مختلف سحاب ایک دوسرے سے علیحدہ ہو رہے ہیں اس لئے اب ہم فرض کرتے ہیں کہ غبارے کو مزید ہوا بھر کر پھیلایا جا رہا ہے۔ اس کا اثر یہ ہوگا کہ ہر دو سحابوں کا درمیانی فاصلہ بڑھتا جائے گا طبعی کائنات صرف سحابوں کے نظام کا نام ہے اس کے علاوہ سائنس میں کائنات کا کوئی اور مفہوم نہیں۔ جب سحابوں کا فاصلہ ہم سے اور ایک دوسرے سے بڑھتا جاتا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ "کائنات پھیل رہی ہے"۔ یہ محض ایک مختصر سائنسی طریقہ ہے اس مطلب کے ادا کرنے کا کہ مختلف سحاب ایک دوسرے سے دور ہو رہے ہیں۔ اخباروں میں اکثر سنسنی خیز سرخیاں کائنات کے پھیلنے کے متعلق دی جاتی ہیں، ان کی حقیقت صرف اسی قدر ہے۔ اس پھیلاؤ کی شرح ایسی ہے کہ ایک ارب تیس کروڑ سال کے بعد کائنات کا نصف قطر دگنا ہو جاتا ہے

یہ پھیلاؤ یوں ہی جاری رہے گا اور اگر ماہرین فلکیات ان سحابوں کا ہمیشہ مشاہدہ کرنا چاہیں تو ان کے لئے ضروری ہو گا کہ ایک ارب تیس کروڑ سال کے بعد اپنی دوربینوں کے دہانے کو دگنا کرتے چلے جائیں۔ لیکن دوربینوں کے متعلق یہ معلوم ہے کہ ایک خاص منزل کے بعد دہانے کو بڑا کرنے سے بھی دوربین کی طاقت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اس لئے ایک وقت آنا لازمی ہے جب کہ تمام سحاب ایک دوسرے کی نظر سے بالکل غائب ہو جائیں گے اور ستاروں کے وہ دھندلے سفید غبار جو اندھیری رات میں اور دوربین کی رو سے دکھائی دیتے ہیں وہ بھی نظر نہیں آئیں گے۔

کائنات کے اس پھیلاؤ کا ایک لازمی نتیجہ یہ ہے کہ روشنی کی شعاع کائنات کا پورا چکر نہیں کر سکتی۔ حساب لگانے پر معلوم ہوا ہے کہ کائنات کا پورا چکر چھ ارب نور سال سے کم اور ساٹھ ارب نور سال سے زیادہ نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ہم یہ فرض کرتے ہیں کہ یہ فاصلہ چھ ارب نور سال ہے۔ اب اگر روشنی کی شعاع ایک لاکھ چھیالیس ہزار میل فی ثانیہ کی رفتار سے کسی مقام سے روانہ ہو تو کائنات کا ایک چوتھائی چکر کرنے میں اس کو ڈیڑھ ارب سال لگیں گے لیکن چونکہ ایک ارب تیس کروڑ سال کے بعد کائنات کے تمام فاصلے دگنے ہو جاتے ہیں اس لئے کائنات کا بقیہ تین چوتھائی فاصلہ اب بجائے ساڑھے چار ارب نور سال کے نو ارب نور سال ہو جائے گا اور اس لئے روشنی کی شعاع جس قدر اپنے ابتدائی مقام کی طرف آگے بڑھے گی وہ مقام اس سے اتنا ہی دور ہوتا جائے گا۔

نظریۂ اضافیت کی بنا پر کائنات کی ابتداء اور اس کے ارتقاء کے متعلق بھی چند معلومات حاصل ہوئی ہیں جن کا ذکر ہم اب کریں گے۔ اس بحث کو شروع کرنے سے قبل ضروری ہے کہ ایک نہایت اہم نکتے کی توضیح کر دی جائے۔ سائنس داں جب ایک ابتدائی وقت کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کا مطلب

وہ وقت ہے جب کہ کائنات یکسانیت کی حالت سے نکل کر تغیر و تبدل کا آغاز کرتی ہے ورنہ ایسے وجود کو جس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہو ہم کسی سائنسی طریقے سے دریافت نہیں کر سکتے۔

یہ فرض کیا جاتا ہے کہ ابتداء میں جب کہ کائنات میں تغیر پیدا ہوا مادہ ابتدائی ذروں یعنی الکٹرون اور پروٹون کی شکل میں ساری فضا میں یکساں طور پر منقسم تھا۔ اور کسی قسم کی کوئی حرکت نہیں پائی جاتی تھی اس وقت کائنات کا نصف قطر تقریباً ایک ارب چھ کروڑ نور سال تھا۔ اس ابتدائی حالت میں کشش اور مدافعت کی وہ دونوں قوتیں جو آئن شٹائن کے قانون تجاذب کی بناء پر ملتی ہیں عین برابر تھیں۔ یہ ایک یکسانیت کی حالت تھی جس کو خارجی طور پر کسی سائنسی طریقے سے محسوس نہیں کیا جا سکتا تھا۔

لیکن علم ریاضی کی بناء پر معلوم ہوتا ہے کہ یکسانیت کی یہ حالت قائم یعنے ہمیشہ برقرار نہیں رہ سکتی بلکہ ذرا سا خلل بھی اس یکسانیت کو توڑ دینے کے لیے کافی ہے اس یکسانیت کی حالت میں ایک موقع پر خفیف سا خلل واقع ہوتا ہے یہ خلل کس وجہ سے واقع ہوتا ہے اور خلل ڈالنے والا کون ہے اس کا جواب سائنس نہیں دے سکتی کیونکہ یہ اس کی بساط سے باہر اور اس کے موضوع سے خارج ہے۔ اس کے جواب کے لئے ہمیں مذہب کی طرف رجوع کرنا پڑتا ہے۔ یہی خلل طبیعی کائنات کی آفرینش ہے۔ یکسانیت میں اس خلل کی وجہ سے مقامی انجماد ہوتا ہے یعنے جو مادہ یکساں طور پر پھیلا ہوا تھا وہ مختلف مقاموں پر جمع ہو کر سحابوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ اس طرح کائنات میں سب سے پہلے سحاب پیدا ہوتے ہیں

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ابتداء میں جب کہ یکسانیت کا دور دورہ تھا کشش اور مدافعت کی قوتیں بالکل برابر تھیں لیکن خلل کی وجہ سے کشش کی قوت کم ہو کر مدافعت کی قوت بڑھ جاتی ہے۔ اور مدافعت کے بڑھ جانے کی وجہ سے

مختلف سحاب ایک دوسرے سے دور ہونے لگتے ہیں یعنے کائنات پھیلنے لگتی ہے پھر سحابوں کے دور ہو جانے کی وجہ سے ان کا درمیانی فاصلہ بڑھ جاتا ہے اور چونکہ فاصلہ بڑھنے سے کشش کی قوت کم اور مدافعت کی قوت زیادہ ہو جاتی ہے اس لئے کائنات کے پھیلاؤ میں اور اضافہ ہو جاتا ہے۔ اب یہ سلسلہ یوں ہی جاری رہتا ہے اور کائنات اپنے ارتقائی سفر کی منزلیں طے کرنا شروع کر دیتی ہے۔

یہ پھیلاؤ صرف سحابوں کی حد تک محدود ہے یعنے ایک سحاب بحیثیت مجموعی دوسرے سحاب سے دور ہوتا جاتا ہے لیکن خود ایک سحاب کے اندرونی مادی ذرات کے درمیانی فاصلے دو سحابوں کے درمیانی فاصلے کے مقابلے میں بہت کم ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک ہی سحاب کے اندر کشش کی قوت مدافعت کی قوت سے زیادہ ہوتی ہے اس لئے ایک سحاب میں پھیلاؤ نہیں ہوتا بلکہ اس کے اندر بھی مقامی انجماد ہونے لگتے ہیں جس سے مختلف تارے پیدا ہوتے ہیں جیسے ہمارا سورج ہے گویا کائنات کے ارتقاء میں سحابوں کے بعد دوسرے نمبر پر ستاروں کی پیدائش ہے پھر جوں جوں وقت گذرتا جاتا ہے ستاروں میں بھی مقامی انجماد ہو کر مادہ علیحدہ ہو جاتا ہے اور سیارے وجود میں آتے ہیں جیسے ہماری زمین ہے اسی طرح بعد میں سیاروں سے چاند نکلتے ہیں اور پھر سیاروں پر جہاں کہیں دوسرے ارتقائی حالات موافق ہوں یعنے ہوا، پانی، حرارت وغیرہ مناسب شکلوں میں پائی جائیں تو یکے بعد دیگرے اور بتدریج جمادات، نباتات، حیوانات اور آخر انسان نمودار ہوتے ہیں یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ ہر ارتقائی منزل کے طے ہونے کے لئے کروڑوں سال درکار ہوتے ہیں۔

زمین پر حیات کے نمودار ہونے اور ارتقاء پانے کے متعلق عام طور پر

لوگوں کا خیال ہے کہ اس قانون کا انکشاف ڈارون نے انیسویں صدی میں کیا۔ بہت کم لوگوں کو اس کا علم ہے کہ دسویں صدی عیسوی میں ہی یہ تصور بتدریج تشکیل پا رہا تھا۔ جاحظ وہ پہلا مسلم حکیم تھا جس نے معلوم کیا کہ پرندوں کے مختلف موسموں میں مختلف مقاموں کو ہجرت کرنے کا اثر ان کی نوع پر کیا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ابن مسکویہ نے اس نظریے کو باقاعدہ شکل میں پیش کیا اور اپنی کتاب "الفوز الاصغر" میں اس کو تفصیل سے بیان کیا پھر یہ تصور اسی قدر عام طور پر رائج ہو گیا کہ شاعر اور عامی بھی اس سے مانوس ہو گئے۔ چنانچہ مولانا روم نے حیات بعد الموت کے ثابت کرنے کے لئے اسی قانونِ ارتقا کو استعمال کیا ہے۔ انسان کی تخلیق کا ذکر کرتے ہوئے وہ مثنوی میں فرماتے ہیں:—

"آمدہ اول بہ اقلیم جماد　　　از جمادی در نباتی اوفتاد
سالہا اندر نباتی عمر کرد　　　وز جمادی یاد ناورد از نبرد
وز نباتی چوں بحیواں اوفتاد　　　نامدش حال نباتی ہیچ یاد
ہمچنیں اقلیم تا اقلیم رفت　　　تا شد اکنوں عاقل و دانا و زفت"

مولانا روم اصول ارتقا کے اس قدر معتقد تھے کہ انھوں نے بار بار اس کا ذکر کیا ہے چنانچہ ایک اور مقام پر اس کو مثنوی میں نہایت نفیس پیرایے میں بیان کرتے ہیں:—

"تو ازاں روزے کہ در ہست آمدی　　　آتشی یا خاک یا بادی بدی
گر بداں حالت ترا بودے بقا　　　کے رسیدی مر ترا ایں ارتقا
از مبدل ہستی اول نماند　　　ہستی دیگر بجائے او نشاند
ہمچنیں تا صد ہزاراں ہستہا　　　بعد یک دیگر دوم بہ زابتدا
ایں بقاہا از فناہا یافتی　　　از فنا پس رو چرا بر تافتی"

اسی طرح ایک اور موقع پر وہ کہتے ہیں:۔

"صد ہزاراں حشر دیدی اے عنود | تاکنوں در لحظہ از بدو وجود
از جمادی بے خبر سوئے نما | وز نما سوئے حیات و ابتلا
باز سوئے عقل و تمیزات خویش | باز سوئے خارج این پنج و شش
در فنا ہا این بقا ہا دیدہ | بر بقائے جسم چوں چسپیدہ"

کائنات کی ابتدا اور اس کے ارتقا پر جدید معلومات کی روشنی میں ہم نے مختصر بحث کی ہے اب ہم اس کے دوسرے سرے یعنے کائنات کے انجام پر غور کریں گے انسانوں کے لئے یہ بہت اہم اور دلچسپ سوال ہے کبھی دنیا ختم ہوگی یعنے قیامت آئے گی یا نہیں۔ فلسفہ اور مذہب اس بارے میں جو کچھ کہتے ہیں اس سے آپ کم و بیش واقف ہیں۔ یہ بھی سن لیجئے کہ جدید سائنس کیا کہتی ہے۔

ہم یہ کہہ چکے ہیں کہ ایسی یکسانیت جس میں کسی قسم کا تغیر نہ ہو سائنس کی دنیا میں کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ اس کا عدم اور وجود دونوں برابر ہیں آپ دنیا کے کسی واقعے کی تحلیل کیجئے اس کی حقیقت سوائے اس کے کچھ نہیں کہ مادہ اور توانائی (انرجی) مختلف حالتیں اختیار کرتے ہیں۔ ہم یہاں صرف طبیعی دنیا سے بحث کر رہے ہیں ذہن شعور اور خیال کی دنیا سے ہمیں کوئی سروکار نہیں طبیعی دنیا صرف مادہ اور توانائی کی حالتوں کے تغیروں کا مجموعہ ہے ان تغیرات کے متعلق انیسویں صدی میں ایک انکشاف ہوا تھا جس کا شمار سائنس کے اہم ترین انکشافوں میں ہوتا ہے۔ ہمارے زمانے میں طبیعیات کے باقی تمام قوانین میں کم و بیش انقلاب ہوگیا ہے لیکن یہ قانون ابھی تک اپنی جگہ پر قائم ہے اور علوم طبیعیات، انجینیری اور فلکیات میں بنیادی قانون کا مرتبہ رکھتا ہے۔

اس قانون کو سمجھنے کے لئے ایک دریا کے بہنے پر غور کیجئے۔ دریا کا پانی قدرتی طور پر نشیب کی طرف بہتا ہے۔ بلندی کی طرف نہیں بہتا۔ اسی طرح دنیا میں جتنے تغیر ہوتے رہیں صرف ایک ہی سمت میں ہوتے ہیں مقابل سمت میں نہیں ہوتے افادیت کے نقطۂ نظر سے توانائی کی دو حالتیں ہوتی ہیں، مفید اور غیر مفید۔ آئن شٹائن نے نظریۂ اضافیت میں ثابت کیا ہے کہ مادہ اور توانائی دو مختلف چیزیں نہیں بلکہ ایک ہی چیز کے دو بہروپ ہیں۔ اس واقعے کا ثبوت تجربوں سے بھی مل چکا ہے۔ اس لئے جب ہم توانائی کہیں تو اس میں مادے کو بھی شامل سمجھنا چاہیئے اب توانائی کی ایک تو مقدار ہوتی ہے اور ایک اس کی افادیت۔ مقدار کے لحاظ سے ہماری کائنات کی توانائی مستقل رہتی ہے یہ بقائے توانائی کا قانون ہے لیکن توانائی کی افادیت میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور انیسویں صدی کے جس مشہور قانون کی طرف ہم نے اشارہ کیا ہے اس کا منشاء یہ ہے کہ کائنات میں جب کبھی کوئی تغیر ہوتا ہے تو توانائی جتنی مفید تھی تغیر کے بعد اس سے کم مفید ہو جاتی ہے کوئی تغیر ایسا نہیں ہو سکتا کہ توانائی کی افادیت میں اضافہ ہو یعنے توانائی پہلے کی بہ نسبت زیادہ مفید ہو جائے۔ اگر افادیت کی کمی کو ہم نشیب سے تشبیہ دیں تو کہہ سکتے ہیں کہ توانائی ہمیشہ نشیب کی طرف بہتی ہے علم طبیعیات میں اس قانون کو اس طرح بیان کرتے ہیں کہ دنیا کی "اکارگی" (انٹروپی) میں ہمیشہ اضافہ ہوتا ہے کبھی کمی نہیں ہوتی اس لحاظ سے توانائی کا کم مفید ہونا اکارگی میں اضافے کے مماثل ہے۔ یاد رہے کہ توانائی کی افادیت اور توانائی کی مقدار دو مختلف چیزیں ہیں۔

ابتدا میں کائنات کی ساری توانائی مفید ترین حالت میں تھی اور تغیروں کے واقع ہونے کے ساتھ ساتھ توانائی کی افادیت میں کمی ہوتی گئی موجودہ زمانے میں توانائی کا ایک حصہ مفید حالت میں اور باقی حصہ غیر مفید حالت میں ہے۔

ہر تغیر میں مفید حالت کم اور غیر مفید حالت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا ضرور آئے گا کہ تمام توانائی غیر مفید حالت میں منتقل ہو جائے گی۔ اس کے بعد پھر کوئی تغیر ہونے کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ تغیر اسی صورت میں ہو سکتا ہے جب کہ کچھ نہ کچھ حصہ کسی قدر مفید حالت میں ہو تمام توانائی کے کامل غیر مفید حالت میں منتقل ہو جانے کو ہم دوسرے طور پر یوں بیان کر سکتے ہیں کہ کائنات کی ناکارگی اپنی سب سے بڑی قیمت پر پہنچ چکی۔ اس کے بعد پھر وہی یکسانیت چھا جاتی ہے اور کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ دنیا چونکہ تغیروں کا مجموعہ ہے اس لیے جب ساری کائنات میں کوئی تغیر نہیں ہو سکے گا تو بس یہی دنیا کا خاتمہ اور قیامت ہے۔

سات سال قبل تک جدید سائنس کے اصول کا یہ نتیجہ ناقابل انکار تھا کہ دنیا کا خاتمہ یقینی اور اٹل ہے اگرچہ اس کے لئے ابھی کروڑوں صدیاں درکار ہیں لیکن ابھی حال میں چند محققین نے نظریۂ اضافیت کی بناء پر یہ خیال پیش کیا ہے کہ دنیا میں ایسے تغیر بھی ہو سکتے ہیں جن میں ناکارگی کا بڑھنا ضروری نہیں اس سے ممکن ہے کہ کائنات میں ابدالآباد تک تغیر ہوتے چلے جائیں اور دنیا کا کبھی خاتمہ نہ ہو۔ اس نئے نتیجے کی صورت ابھی مسلم نہیں اور اس پر بہت کچھ کام کرنا باقی ہے۔ فی الحال سائنس میں وہی انیسویں صدی والا قانون رائج ہے کہ ہر تغیر میں کائنات کی ناکارگی بڑھتی جاتی ہے یعنی توانائی کم مفید ہوتی جاتی ہے۔

غرض جدید سائنس جس نتیجے پر پہنچی ہے وہ یہ ہے کہ:۔

"فنا را بادۂ ہر جام کردند   چہ بیدردانہ او را عام کردند
تماشا گاہ مرگ ناگہاں را   جہان ماہ و انجم نام کردند"

سائنس کے اس یاس انگیز فیصلے اور سزائے موت کے جواب میں مذہب اور ایمان ہمیں یقین دلاتے ہیں کہ کچھ پروا نہیں یہ طبیعی کائنات صرف ایک منزل ہے اس کے ختم ہونے کے بعد بھی ہمارے لئے ارتقاء کی دوسری منزلیں موجود ہیں۔

ستاروں سے آگے جہاں اور بھی ہیں — ابھی عشق کے امتحاں اور بھی ہیں
اسی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا — کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں
اگر کھو گیا اک نشیمن تو کیا غم — مقاماتِ آہ و فغاں اور بھی ہیں

رضی الدین صدیقی



قطب شاہی دور کا نظام تعلیم

محمد شاہ ثانی بہمنی سلطنت کا تیرھواں حکمران تھا۔ اس کے آخری زمانے سے بہمنی سلطنت کا زوال شروع ہو گیا جب اس سلطنت میں انتظامی مصلحتوں سے بڑے بڑے صوبے قائم کئے گئے تو ابتداً اس سے بڑی مدد ملی لیکن بعد میں بہمنی سلطنت کا شیرازہ بکھرنے کا ایک بڑا سبب بنا کیونکہ مرکزی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ان صوبہ داروں (گورنروں) نے اپنی خودمختاری کا اعلان کرنا شروع کیا۔ محمد شاہ ثانی کے بعد اس کا بیٹا محمود شاہ ثانی کمسنی میں تخت نشین ہوا تھا۔ ایک طرف اس کی صغیر سنی اور دوسری طرف مرکز کی کمزوری نے صوبوں کے اعلیٰ افسروں کو خودمختار ریاستوں کے قائم کرنے پر راغب کیا۔ چنانچہ برار میں عماد شاہی سلطنت (سنہ ۱۴۸۴ تا سنہ ۱۵۷۲ء) بیجاپور میں عادل شاہی سلطنت (سنہ ۱۴۸۹ تا سنہ ۱۶۸۶ء) احمد نگر میں نظام شاہی سلطنت (سنہ ۱۴۹۰ تا سنہ ۱۵۹۵ء) اور بیدر میں برید شاہی سلطنت (سنہ ۱۴۹۲ تا سنہ ۱۶۰۹ء) خودمختار ہو گئیں۔ اگرچہ امیر الامراء نمازی ملک قطب الملک کے ہاں قوت اور ساز و سامان کی کمی نہ تھی اور گولکنڈے کے صوبہ دار کی حیثیت سے ایک وسیع رقبہ بھی ان کے زیر نگین تھا تاہم اپنے آقا سلطان محمود شاہ ثانی کے

ساتھ وفاداری نے انہیں اپنی خود مختاری کا اعلان کرنے سے باز رکھا۔ جب سنہ ۱۵۱۸ میں سلطان محمود نے وفات پائی تو پھر گولکنڈے میں خود مختار سلطنت قائم کرنی پڑی۔

سلطنت بہمنیہ کی جگہ پانچ چھوٹی چھوٹی خود مختار راجدھانیوں کا قیام دکن کے لئے مفید ہی ثابت ہوا کیونکہ بہمنی سلطنت کے آخری زمانے میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو قریب تر نگرانی کی وجہ سے ایک حد تک دور کر دیا جا سکا اور ان سلطنتوں نے نہ صرف بہمنیوں کی عمدہ روایات کو برقرار رکھا بلکہ مختلف شعبوں میں نئے زرین کارنامے انجام دئے خاص کر ان کی تعلیمی خدمات بڑی اہمیت رکھتی ہیں۔ اگرچہ اس بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن اب بھی بہت کچھ باقی رہ گیا ہے۔ اس مقالے کا تعلق اس وسیع موضوع کے صرف ایک جزء سے ہے چنانچہ یہاں سلاطین قطب شاہی کے نظام تعلیم و تربیت کے متعلق چند پہلو نمایاں کئے جائینگے۔

قطب شاہی سلاطین نے سنہ ۱۵۱۸ سے سنہ ۱۶۸۷ تک حکومت کی ان کا مقبوضہ علاقہ وسیع تھا چنانچہ شمال میں دریائے گوداوری اور جنوب میں دریائے پنار سرحد تھی تو مشرق میں خلیج بنگالہ کا ساحل اس کی حد تھا اور اس میں وہ رقبہ بھی شامل تھا جو شمالی سرکار کے نام سے موسوم ہے۔ اس سلطنت کے مغرب میں بیدر اور بیجاپور کی سلطنتیں واقع تھیں۔ دوسرے الفاظ میں قطب شاہی علاقہ آب و ہوا پیداوار اور محل وقوع کے لحاظ سے وہ تمام سہولتیں رکھتا تھا جو اس سلطنت کی فلاح میں ممد و معاون ثابت ہوئیں۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں بہت سے تاریخی آثار بھی موجود تھے جنکی روایات کے باقیات قطب شاہی سلاطین کے تعمیری کاموں میں ایک محرک متصور ہو سکتے ہیں۔

اس سلطنت میں آٹھ بادشاہ گذرے ہیں جن کی تفصیل یہ ہے :-

۱۔ سلطان قلی قطب شاہ (حکمرانی سنہ ۱۵۱۸ تا سنہ ۱۵۴۳) ۲۔ جمشید قطب شاہ بن سلطان قلی قطب شاہ (سنہ ۱۵۴۳ تا سنہ ۱۵۵۰) ۳۔ سبحان قلی قطب شاہ بن جمشید قطب شاہ (سنہ ۱۵۵۰ سے چھ ماہ تک) ۴۔ ابراہیم قطب شاہ بن سلطان قلی قطب شاہ (سنہ ۱۵۵۰ تا سنہ ۱۵۸۰) ۵۔ محمد قلی قطب شاہ بن ابراہیم قطب شاہ (سنہ ۱۵۸۰ تا سنہ ۱۶۱۱) ۶۔ سلطان محمد قطب شاہ برادرزادہ محمد قلی قطب شاہ و ابن محمد امین (سنہ ۱۶۱۱ تا سنہ ۱۶۲۶) ۷۔ عبد اللہ قطب شاہ سنہ ۱۶۲۶ء تا سنہ ۱۶۷۲ء ۸۔ ابوالحسن تانا شاہ داماد عبد اللہ قطب شاہ (سنہ ۱۶۷۲ تا سنہ ۱۶۸۷) تانا شاہ کو سنہ ۱۶۸۷ء میں اورنگ زیب کے ہاتھوں شکست ہوئی پھر اسے دولت آباد میں نظر بند رکھا گیا جہاں سنہ ۱۷۰۴ء میں اس کا انتقال ہوا۔

قطب شاہی دورِ حکومت کافی پُر آشوب رہا۔ سلطان قلی قطب شاہ کو اپنی ہمسایہ حکومتوں سے کئی بار جنگ کرنی پڑی چنانچہ دیجانگر کے راجہ کرشنا دیو رایا سے پانگل کے قریب لڑائی ہوئی جس میں راجہ کو شکست ہوئی اور گھن پورہ اور کوپاکنڈہ کے علاقے قطب شاہی سلطنت میں شامل کر لئے گئے بیجاپور کے اسمٰعیل عادل شاہ سے بھی ایک لڑائی ہوئی جس کے نتیجے کے طور پر میدک اور کولاس کے علاوہ بیدر کا کچھ رقبہ بھی قطب شاہی سلطنت میں شامل ہو گیا تلنگانہ اور اڑیسہ کی لڑائیوں میں بھی سلطان قلی قطب شاہ کو کامیابی ہوئی اور الور اور بجواڑہ کا الحاق عمل میں آیا اسی طرح کرشنا راؤ کی شکست کی وجہ سے مچھلی پٹم پر بھی قبضہ ہو گیا۔ جمشید قطب شاہ کو احمد نگر، بیجاپور اور بیدر کی بین الممالک جنگ میں حصہ لینا پڑا اور اس سے قطب شاہی سلطنت کو بڑا فائدہ ہی حاصل ہوا۔ کیونکہ رقبے کی توسیع کے علاوہ اپنی مملکت کے آخر میں بھی معتدبہ اضافہ ہوا۔ ابراہیم قطب شاہ کو بھی احمد نگر، بیجاپور اور وجیانگر کے خلاف لڑائیاں لڑنی پڑیں۔ ان کے سوا راجا سے کونڈبیر اور مہتاب خاں زمیندار ورنگل

سے بھی اس کے کامیاب مقابلے رہے اور ہر وقت سلطنت کے حدود میں توسیع ہی ہوتی گئی۔ محمد قلی قطب شاہ کا زمانہ مقابلتہً پرامن رہا لیکن اس زمانے میں بھی احمد نگر اور بیجاپور کی لڑائی میں اسے حصہ لینا پڑا۔ محمد قلی قطب شاہ کے زمانے میں تندیال، کرنول، کڑپہ، گنڈی کوٹ، ڈول اور ضلع نلور کا کچھ حصہ بھی اس سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں ملک میں ایک سخت قحط پڑا اور پایہ تخت میں ایک زبردست طغیانی آئی ان کے سوا اورنگ زیب نے اچانک حملہ کر کے تقریباً پایۂ تخت کے حصار تک اپنی فوجیں پہنچا دیں اور عبداللہ قطب شاہ کو مجبور ہونا پڑا کہ ایک بڑی رقم بطور تاوان جنگ ادا کرے اور اورنگ زیب کے بیٹے سلطان محمد کو اپنی بیٹی بیاہ دے۔ اس سے سلطنت کو بڑا بھاری صدمہ پہنچا اور بالآخر جب تانا شاہ کو اورنگ زیب کے ہاتھوں ہزیمت اٹھانی پڑی تو قطب شاہی سلطنت کا خاتمہ ہو گیا۔

یہ بیرونی کشمکشیں تھیں۔ اندرونی سازشوں کا مقابلہ بھی کچھ کم نہ کرنا پڑا۔ سلطان قلی قطب شاہ، جمشید قطب شاہ، ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ ہر ایک کو اس بات کی ضرورت لاحق ہوئی تھی کہ غداروں کو چن چن کر سزا دے۔ تانا شاہ کا زمانہ سب سے زیادہ پرآشوب گذرا ہے اور انہیں اندرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا شکار بن کر اپنے تخت و تاج سے ہاتھ دھونا پڑا۔

لیکن ان تمام دشواریوں اور رکاوٹوں کے باوجود قطب شاہی سلاطین نے اپنے بہت سے کارنامے چھوڑے ہیں۔ ان کا راز بڑی حد تک ان کے مفید اور وسیع نظامِ تعلیم و تربیت میں پنہاں ہے اور نہ صرف خاندان شاہی کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا انتظام رہا بلکہ ملک کی تعلیمی حالت میں بھی بہت کچھ اصلاح و ترقی عمل میں آئی۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت ہر جگہ بادشاہوں کے ذاتی اوصاف اور اخلاق پورے ملک کی فلاح یا مضرت کے ذمہ دار ہوتے تھے۔

قطب شاہی سلاطین کی ذاتی تعلیم و تربیت ان کی سلطنت اور ان کی رعایا کے حالات کو متاثر کئے بغیر نہیں رہی - یہاں اسی کے متعلق بعض واقعات مختصراً بیان کئے جائیں گے۔

سلاطینِ قطب شاہی نہ صرف اعلیٰ تعلیم کا خود نمونہ بنے رہے بلکہ ملک کی تعلیمی چہل پہل کی بھی انہوں نے بڑی سرپرستی کی۔ سلاطین قطب شاہی کی تعلیم و تربیت کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے تمدنی، دوسرے افادی یا عملی اور تیسرے اخلاقی ان میں سے ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ تذکرہ مفید ہوگا۔

قطب شاہی سلاطین کی تمدنی تعلیم و تربیت ہی کا نتیجہ تھا کہ وہ نہ صرف فنون لطیفہ اور فن تعمیر کی سرپرستی کرتے رہے بلکہ خود بھی مختلف فنون لطیفہ میں درک رکھتے تھے اور ان کا ذوق سلیم نفیس یادگاریں چھوڑنے کا باعث ہوا ہے - اس دور کی خوشنما عمارتوں سے ہم کو دو سبق ملتے ہیں ایک تو ان سلاطین کا تعمیری ذوق جن کے عہد اور جن کی سرپرستی میں یہ عمارتیں نمودار ہوئیں اور دوسرے ان عمارتوں کی وجہ سے جو لطیف ماحول پیدا ہو گیا تھا اس نے غیر محسوس لیکن موثر طور سے عوام الناس میں بھی جمالیاتی ذوق پیدا کر دیا ہوگا اور اس کے جو مفید نتائج برآمد ہوئے ہونگے ان کا ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے۔

قطب شاہی عمارتیں مختلف قسم کی تھیں جن سے ملک اور رعایا کی ہر قسم کی ضرورتیں پوری ہوتی تھیں شاہی ایوانوں کے علاوہ، چمن، باغ، حمام، حوض، گنبد، کمانیں، لنگر خانے، مسافر خانے، مسجدیں، مدرسے، عاشور خانے، بازار، تالاب، قلعے وغیرہ ان میں شامل ہیں - نئے شہر بھی بسائے گئے، سڑکیں بنائی گئیں، آبرسانی کے نادر روزگار انتظامات کئے گئے جن کے آثار ابتک باقی ہیں - ان تمام تعمیری کاموں میں مرکزی تصور یہ رہا کہ حسن اور ذوق دونوں کو فن کارانہ سا

سے اظہار کا پورا پورا موقع دیا جائے اس زمانے کی عمارتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ موزوں مقام کا انتخاب کیا جاتا تھا اور اندرونی اور بیرونی آرائش سے عمارت کو نہ صرف فن لطیف کا ایک اچھا نمونہ بنانے کی کوشش کی جاتی تھی بلکہ اپنے ماحول کے قدرتی آثار سے بھی ہم آہنگ بنایا جاتا تھا ان کثیر اور عظیم الشان تعمیری کارناموں سے سلطنت کی سرسبزی اور خوش حالی کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس زمانے کی دوسری چیزوں مثلاً زیورات، لباس، آلات، ظروف وغیرہ سے بھی ہمیں اسی نتیجے پر پہنچنا پڑتا ہے ادبیات کے سلسلے میں بھی جس کی تفصیل آگے آئے گی یہ چیز ہر جگہ نمایاں ہے کہ قطب شاہی سلاطین کا ادبی ذوق اور ادیبوں کی سرپرستی اس تمدنی تعلیم و تربیت کا ناگزیر نتیجہ تھی جس کے لئے قطب شاہی سلاطین شہرت رکھتے ہیں۔ اس دور کے ادبا و شعرا کے شہ کار بھی اصل میں اپنے حکمرانوں کے ذوق کے رہین منت ہیں۔

قطب شاہی سلاطین کی افادی یا عملی تعلیم بھی بہت بارآور ثابت ہوئی۔ یہی وجہ ہے کہ جنگ اور امن ہر زمانے میں وہ کامیاب رہے فن سپہ گری میں انہوں نے اپنی فوجوں کو کارکردگی کے جس اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا تھا اس کا ثبوت ان عظیم فتوحات اور کثیر توسیعات سے ملتا ہے جو تقریباً ہر حکمران کے زمانے میں انکی سلطنت کے رقبے کے متعلق عمل میں آتی رہیں۔ مغلوں کے مقابلے میں عبداللہ قطب شاہ و تانا شاہ کو جو ہزیمت اٹھانی پڑی وہ فوجی تربیت میں کسی خامی کے باعث نہ تھی اور نہ ان کی تیاریوں میں کوئی سقم تھا بلکہ فوجی افسروں اور مصاحبوں کی سازشیں اور رقابتیں تھیں جنہوں نے سلطنت کی جڑوں کو کھوکھلا کر دیا تھا۔

سیاست مدن کے متعلق بھی ان کی خاصی اچھی تربیت ہوتی رہی ہوگی

کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جمشید قطب شاہ نے احمد نگر، بیجا پور اور بیدر سے ایسے معاہدے کرائے تھے جو ہر طرح اس کے مفید مطلب تھے۔ ابراہیم قطب شاہ کی حکمت عملی ہی نے گولکنڈہ، احمد نگر، بیدر اور بیجا پور کو وجیانگر کے خلاف متحد کیا تھا اور تالی کوٹہ کی جنگ میں ان چاروں سلطنتوں کی مشترکہ کوشش سے وہ عہد آفریں مقصد حاصل ہوا تھا جس کا خواہشمند ہر ایک تھا لیکن جس کے حصول کی صلاحیت انفرادی طور سے کسی میں بھی نہ تھی۔

قطب شاہی سلاطین کی عملی تعلیم کا ایک ثبوت اس واقعے سے ملتا ہے کہ باوجود نسلاً بعد نسل تک مسلسل لڑائیوں میں مصروف رہنے کے ان کی سلطنت مالی حیثیت سے ترقی کرتی رہی۔ انہوں نے زراعت تجارت اور صنعت کی بڑی حوصلہ افزائی کی معدنیات دریافت کئے اور ان کی کھدائی سے فائدہ اٹھایا۔ تجارت کے سلسلے میں ولندیزیوں کا ۱۶۱۵ء میں اور انگریزوں کا ۱۶۲۲ء میں مچھلی پٹم میں تجارتی کوٹھیاں قائم کرنا قابل ذکر ہے ملک کی معاشی خوشحالی ہی کے باعث بڑی بڑی رقمیں رفاہ عام کے کاموں پر صرف کی جا سکیں ابراہیم قطب شاہ نے قلعہ گولکنڈہ کے استحکامات پر بیس لاکھ روپے صرف کئے تھے اور خیر خیرات پر ہزار روپے سالانہ خرچ کئے جاتے تھے محمد قلی قطب شاہ تو سرکاری عمارتوں کی تعمیر پر (۴۲) لاکھ روپے سالانہ اور خیرات مبرات پر (۴۳) لاکھ روپے سالانہ خرچ کیا کرتا تھا۔ محمد قطب شاہ نے اپنے نئے شہر کی تعمیر پر (۹) لاکھ روپے خرچ کئے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ نے گوشہ محل کی تعمیر پر ساڑھے تین لاکھ روپے لنگم پلی کے باغ پر تین لاکھ روپے قلعہ گولکنڈہ کی ترمیم و استحکام پر چھ لاکھ روپے صرف کئے تھے قطب شاہی دور کی خوشحالی کا اندازہ اس واقعے سے ہو سکتا ہے کہ ۱۶۸۵ء میں مغلوں

کی آمد کے باعث جب پایہ تخت میں سراسیمگی پیدا ہوئی اور لوٹ مار مچی تو غائب املاک اور شاہی خزائن وغیرہ سے کوئی چار پانچ کروڑ کی دولت تلف ہوئی تھی - اسی سال جب تانا شاہ نے اورنگ زیب سے صلح کی تو تانا شاہ نے بطور تاوان جنگ یکمشت ایک کروڑ بیس لاکھ روپے اور سالانہ دو لاکھ روپیے دینا منظور کیا تھا۔ ۱۶۸۷ء میں جب گولکنڈہ فتح ہوا تو خزانہ شاہی سے سونے کے (۶۱) لاکھ (۵۱) ہزار ہُن اور چاندی کے ۲ کروڑ ۳ ۵ ہزار روپے اور تانبے کے ایک ارب ۵ اکروڑ پیسے مغلوں کے ہاتھ آئے تھے۔ ان سب کی مجموعی رقم ۳۲ اکروڑ روپے قرار دی جاتی ہے - جواہرات اور سونے چاندی کے ظروف وغیرہ ان کے ماسوا تھے۔

قطب شاہی سلاطین کی اعلیٰ تعلیم و تربیت کا نتیجہ ایک یہ بھی تھا کہ انہوں نے ہر وقت اپنی رعایا کی فلاح و بہبود میں سرگرم حصہ لیا اور مذہبی کاموں میں بڑی دلچسپی لی - تمام مورخوں نے بیان کیا ہے کہ قطب شاہی سلاطین کے جود و کرم سے مستحق اہل ملک ہی نہیں بلکہ بیرون ملک کے علماء و فضلاء وغیرہ بھی بہرہ اندوز ہوتے تھے - عرب عراق اور ایران کے مقدس مقامات کو ان سلاطین کی طرف سے وقتاً فوقتاً قیمتی چڑھاوے اور تحائف بھیجے جاتے رہے۔ ملک میں رفاہی کاموں کا جو انتظام کیا گیا اس سے ہزاروں کے لئے روزگار پیدا ہو گیا تھا اور علاوہ مزدوری کے ان لوگوں کو ہر وقت انعام و اکرام سے بھی سرفراز کیا جاتا تھا قطب شاہی دور کی مسجدیں، عاشور خانے، شفاخانے لنگرخانے وغیرہ اب تک بکثرت پائے جاتے ہیں جن سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ان سے اور کتنی زیادہ رفاہِ عام کی عمارتیں اپنے زمانے میں نہ تیار کی گئی ہوں گی۔

سلاطین گولکنڈہ بڑے راسخ العقیدہ حکمران تھے اور اولیاء و صلحا کے ساتھ نہایت احترام کا برتاؤ کرتے تھے چنانچہ ان کے نام کئی قسم کی امدادیں اور روزینے جاری ہوتے تھے اور ان کی قبروں پر بطور یادگار عظیم الشان گنبد وغیرہ تعمیر ہوتے تھے۔ اس سلسلے میں حضرت میر مومنؒ، حضرت شاہ راجوحسینی ثانی، حضرت حسین شاہ ولی صاحبؒ اور حضرت شاہ میراںؒ کے اسمائے گرامی بطور نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں اپنی خانگی زندگی میں بھی ان سلاطین نے اچھے نمونے چھوڑے تھے چنانچہ تاریخوں سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان قلی قطب شاہ صوم و صلوٰۃ کا شدت سے پابند تھا اور جس وقت اسے شہید کیا گیا تو وہ قلعہ گولکنڈہ کی مسجد میں فجر کی نماز میں مشغول تھا۔

محمد قلی قطب شاہ اگرچہ اکثر رنگیلے روپ میں پیش کیا جاتا ہے لیکن وہ میلاد نبوی کا وسیع پیمانے پر انتظام کرتا اور محرم کا سختی سے احترام کرتا تھا۔ محمد قطب شاہ نے مکہ مسجد کی تعمیر کا آغاز کیا تھا۔ اس کا سنگ بنیاد رکھنے کے لئے ایسے شخص کی تلاش تھی جس کی کبھی نماز قضا نہ ہوئی ہو اور سوائے خود بدولت کے ملک بھر میں ایسا شخص نہ مل سکا تھا۔ یہاں تک بیان کیا جاتا ہے کہ وہ تہجد کا بھی سختی سے پابند تھا۔ عبداللہ قطب شاہ کے زمانے میں میلاد نبوی کی تقریب بڑے کروفر سے منائی تھی۔ خود تانا شاہ بھی مذہب سے اتنا بیگانہ نہ تھا جتنا خیال کیا جاتا ہے۔ اس نے اولیاء اللہ اور درگاہوں کو جو امدادیں جاری کی تھیں اور عاشور خانوں وغیرہ کے لئے جو رقمیں اس نے منظور کی تھیں وہ یقیناً اس بات کا ثبوت ہیں کہ مذہب کا اس کے دل میں کافی احترام تھا۔

قطب شاہی سلاطین نے بعض عمارتیں خالص مذہبی مقاصد کے تحت تعمیر کی تھیں۔ محمد قلی قطب شاہ نے خداداد محل بنایا تھا جس کی سات یا آٹھ منزلیں تھیں جن کے حسب ذیل نام ہم تک پہنچے ہیں: موسوی محل، جعفری محل، حسینی محل

حسنی محل، حیدری محل، محمدی محل، الہی محل۔ ایک اور عمارت کا نام داد محل رکھا گیا تھا جہاں عدل و انصاف کیا جاتا تھا اور بلا لحاظ جاہ و رتبہ ہر شخص کو اجازت تھی کہ براہِ راست بادشاہ سے عرض حال کریں اور حق رسی عمل میں آئے۔

قطب شاہی سلاطین کے کتبوں اور سکوں سے بھی ان کے مذہبی احساسات کا ثبوت ملتا ہے۔ اس دور میں جو مذہبی کتابیں تصنیف یا ترجمہ ہوئیں وہ بھی براہ راست یا بالواسطہ شاہی سرپرستی کی ممنون منت تھیں۔

قطب شاہی حکمرانوں کے زمانے میں تعلیم کی جو ترقی ہوئی تھی اس کا باعث بھی یہ تھا کہ بکثرت علماء و فضلاء شاہی سرپرستی کے باعث ہر طرح کے آلائش دنیوی سے بےنیاز ہو کر پورے انہماک کے ساتھ علم و اخلاق کی ترویج میں مصروف رہتے تھے۔ ان کو شاہی دربار میں بھی ممتاز جگہ حاصل تھی۔ چنانچہ امیر شاہ انجو، امیر عماد الدین محمد شیرازی، قاسم بیگ شیرازی، حسین قلی مرزا، خورشاہ بن قباد الحسینی وغیرہ ابراہیم قطب شاہ کے دربار میں رسوخ رکھتے تھے۔ فیروز اور محمود بھی اسی دربار کے مشہور اردو شعراء تھے۔ محمد قلی قطب شاہ کے درباری علماء میں سے میرک معین سبزواری، قاضی سمنانی، مرزا محمد امین اور حضرت میر مومن رح کا نام لینا کافی ہوگا۔ شعراء ان کے علاوہ تھے۔ وجہی اور احمد مشہور اردو شعراء گذرے ہیں۔ سلطان محمد قطب شاہ کے دربار میں بھی سید کمال الدین مازندرانی اور میر قطب الدین نعمت اللہ جیسے باکمال فضلاء موجود تھے۔ عبداللہ قطب شاہ کے دربار میں میر مجد الدین رونقی، قاضی حسن، شیخ عبداللطیف، شیخ ہارون اور عبدالجبار نے شہرت حاصل کی۔ اس دور کے اردو شعراء غواصی اور ابن نشاطی ہیں۔ تانا شاہ کا پُر آشوب دور بھی علم و ادب کی سرپرستی سے خالی نہ رہا چنانچہ میر غلام علی لطیف، نوری، شاہی، فائز اور شعور اس دور کے مشہور اردو شعراء تھے۔

قطب شاہی سلاطین میں قریب قریب سب ہی صاحب علم تھے۔ جمشید نہ صرف شاعر تھا بلکہ فی البدیہہ بھی اشعار کہنے میں خاص ملکہ رکھتا تھا۔ ابراہیم قطب شاہ کی فارسی شاعری ممتاز درجہ رکھتی ہے۔ محمد قلی قطب شاہ کا علمی ذوق سب سے بڑھا چڑھا تھا اردو اور فارسی میں شعر کہتا تھا اردو میں صاحب دیوان بھی تھا۔ سلطان محمد قطب شاہ نہ صرف شاعر تھا بلکہ مورخین کا خیال ہے کہ مختلف مضامین پر اس نے رسالے بھی تالیف کئے تھے۔ عبداللہ قطب شاہ بھی اچھا شاعر تھا تانا شاہ کو جو ادبی ذوق اور شاعری کا چسکا تھا اسے قید و نظر بندی نے بھی پامال کرنے میں کامیابی حاصل نہیں کی تھی اگرچہ سلطان قلی قطب شاہ کے ادبی کارناموں کا کوئی خصوصی پتہ نہیں چلا ہے لیکن اس کی تلافی اس کے حسن انتظام اور ترقی علم کے شوق سے ہو جاتی ہے۔ بیچارہ سبحان قلی قطب شاہ سات برس کی عمر میں تخت نشین ہوا تھا اور چھ ماہ بعد ہی اس کا دور حکومت ختم ہو گیا تھا۔ اس ایک استثنار کے علاوہ باقی تمام سلاطین علمی ذوق اور ملکہ رکھتے تھے اور اشاعت علم کا بھی ان کو بڑا شوق تھا۔ یہ خصوصیت صرف حکمرانوں ہی سے نہ تھی بلکہ شاہی خاندانوں کے دیگر افراد بھی اس بارے میں خاص شہرت رکھتے ہیں مثلاً قلی قطب شاہ کے بڑے بھائی شاہ عبدالقادر نہ صرف اچھے عالم تھے بلکہ اپنے زہد و تقوی کی وجہ سے شاہ کے لقب سے موسوم ہونے لگے تھے۔ محمد قلی قطب شاہ کا چھوٹا بھائی ابوالفتح عربی میں خاص دستگاہ رکھتا تھا اور قران مجید کی صحیح لب و لہجہ سے تلاوت کر سکتا تھا۔ محمد قلی کا ایک اور بھائی حسین قلی بھی اپنی علمیت کے باعث مشہور رہے اس کا سب سے چھوٹا بھائی محمد امین بھی اعلیٰ تعلیم میں کسی سے کم نہ تھا۔

شاہی خاندان کی بعض خواتین بھی تعلیم و تربیت، فہم و فراست اور خیرات و مبرات میں خاص شہرت رکھتی ہیں مثلاً محمد قلی قطب شاہ کی بہن خدیجہ سلطان یا محمد قلی قطب شاہ

کی بیٹی اور عبداللہ قطب شاہ کی ماں حیات بخشی بیگم جن کو اہل دکن نے محبت سے ماں صاحب کا نام دیا تھا اور اب تک ماں صاحب کا تالاب حیات نگر کی مسجد اور خانقاہ گولکنڈہ کی عظیم الشان جامع مسجد وغیرہ ان کی یادگاریں باقی ہیں اور تعمیری پختگی کے باعث اب تک اچھی حالت میں موجود ہیں بلکہ زیر استعمال ہیں۔

اردو کی ترقی اور ترویج میں قطب شاہی سلاطین نے جو حصہ لیا وہ سب جانتے ہیں۔ اگر ان سلاطین کے دوسرے تمام علمی اور ادبی کارنامے نظر انداز بھی کردیئے جائیں تو بھی اردو کے لئے ان کی خدمات اتنی اہم رہی ہیں کہ کسی طرح فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ یہ بات دلچسپ بھی ہے اور تعجب خیز بھی کہ محمد قلی قطب شاہ کو تلنگی کا بھی بڑا ذوق تھا اور تلنگی میں شعر بھی کہتا تھا۔ بعض مورخین نے اسے تلنگی کا صاحب دیوان شاعر بھی ہونا بیان کیا ہے۔ ابراہیم قطب شاہ مشہور تلنگی شاعر آدن کی گنگادہر کا بڑا قدر دان تھا۔ تلنگی رعایا میں اسے اس قدر ہر دلعزیزی حاصل تھی کہ اس کا نام ابراہام زبان زد خاص و عام ہو گیا تھا۔

قطب شاہی دور میں عربی فارسی اردو تلنگی میں اچھی کتابیں لکھی جاتی رہیں تاریخ فلسفہ، ادب، لغت، سائنس وغیرہ پر جو کتابیں لکھی گئیں ان میں سے چند کے نام یہ ہیں: تاریخ قطب شاہی، فلک البروج، مصباح الارواح، قدرت نامہ ظفر القلوب، حدیقہ السلاطین، برہان قاطع وغیرہ۔

مدرسوں کی تعداد بھی اس زمانے میں کم نہ ہوگی ان کی صحیح تعداد کا پتہ چلانا تو دشوار ہے لیکن بہرحال مدرسوں کے لئے مکان، معلمین، آلاتِ تعلیم وغیرہ کی فراہمی بڑی حد تک سلاطین کی داد و دہش پر منحصر تھی کئی مدرسے تو براہ راست شاہی نگرانی اور سرپرستی میں کام کرتے تھے۔ ابراہیم قطب شاہ، محمد قلی قطب شاہ اور عبداللہ قطب شاہ نے متعدد نئے مدرسے قائم کئے۔ جب شہر حیدرآباد

کی بنیاد رکھی گئی تو اس کی تعمیر کا آغاز چار مینار سے ہوا۔ اور یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ عمارت مدرسے ہی کے اغراض کے لئے عرصے تک کام میں لائی جاتی رہی اور اس عمارت کی چھت پر اب تک مسجد، حوض وغیرہ باقی ہیں۔ خود طلباء اور معلمین کی رہائش کے کمرے بھی اس میں رہے۔ کہتے ہیں کہ یہاں نہایت قابل معلمین کا تقرر کیا گیا تھا جنہیں اچھا مشاہرہ دیا جاتا تھا۔ حیدرآباد کی جامع مسجد محمد قلی قطب شاہ نے تعمیر کرائی تو اس سے ملحق ایک مدرسہ بھی تعمیر کیا گیا جو ایک اقامتی درس گاہ تھا۔

سرکاری مدارس کے علاوہ اس دور میں خانگی مدارس بھی قائم ہوئے تھے جن میں سے بعض کو سرکاری امداد ملتی تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ مدارس چاہے خانگی ہوں یا شاہی بالعموم بڑے شہروں یا ان کے اطراف و اکناف میں قائم تھے کیونکہ ان کی مانگ بھی یہیں ہوتی تھی۔ دیہات کے لوگوں کو تعلیم سے زیادہ روزگار کی فکر رہتی تھی البتہ ہر جگہ مساجد کے ساتھ تحتانی مدارس قائم تھے جن کو مکتب کا نام دیا جاتا تھا۔ ان میں ابتدائی مذہبی تعلیم کے علاوہ تھوڑی بہت عام دنیوی تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ مساجد کے موذن اور امام ان مکتبوں کے ذمہ دار ہوتے تھے اور طلباء کی تعداد میں اضافہ یا کمی انہیں لوگوں کی علمیت اور اخلاق کی مناسبت سے ہوا کرتی تھی۔ ایسے واقعات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ مختلف علماء بلا معاوضہ مساجد میں یا گھر پر تعلیم دیا کرتے۔ بڑی مسجدوں سے ملحق کتب خانے بھی ہوا کرتے۔ ظاہر ہے کہ بڑی مسجدوں میں جو تعلیم دی جاتی تھی اس کا معیار خاصا بلند ہوتا تھا۔ یہ امر خاص طور سے واضح کرنے کے قابل ہے کہ سرکاری مدارس کے مقابلے میں مساجد کی تعلیم باوجود غیر سرکاری ہونے کے زیادہ مستحکم بنیادوں پر قائم تھی۔ کیونکہ سیاسی انقلابوں اور شاہ گردیوں کا ان پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا تھا اور ہر جانشین

حکمران ایسے اداروں کی سرپرستی اپنا اولین فرض تصور کرتا تھا عوام بھی مذہبی وجوہ سے مساجد کا احترام کرتے اور دامے درمے اس پر کچھ خرچ کرنے سے دریغ نہیں کرتے تھے ان مکاتب کے استحکام کا ایک اور باعث یہ بھی تھا کہ یہاں کی تعلیم سادہ اور کم خرچ ہوتی تھی اور وہاں تعلیم جاری رکھنا طلبا کے لئے آسان ہوتا تھا قطب شاہی دور میں جس کثرت سے نئی مسجدیں تعمیر ہوئیں اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بیجا نہ ہوگا کہ بیک وقت مذہب اور تعلیم دونوں کے فروغ سے دلچسپی رکھتے تھے۔

سلاطین نے اولیا اللہ اور بزرگان دین کی جو سرپرستی کی وہ بھی بالواسطہ تعلیمی ترقی کا باعث تھی کیونکہ ایسے لوگ عوام میں عزت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے اور وہ دینی و روحانی معلم تصور ہوتے تھے۔ یہ لوگ اپنی خانقاہوں وغیرہ میں طلبہ کے دل اور دماغ کی آراستگی میں ہمیشہ مصروف رہتے تھے قطب شاہی دور کے مشہور بزرگوں میں حضرت میر مومن نہ صرف زہد و تقویٰ میں امتیاز رکھتے تھے بلکہ علم و فضل میں بھی ان کا بڑا پایہ تھا۔ انہوں نے بہت سی کتابیں تصنیف کی تھیں اور رموز مملکت میں بھی سلاطین کو ان کی مدد حاصل رہتی تھی حضرت میراں شاہ حسین نے بھی کئی کتابیں تصنیف کیں جن میں وجودیہ خاص طور پر مشہور ہے حضرت شاہ راجو ثانیؒ اور حضرت حسین شاہ ولیؒ بھی جید عالم تھے ملک میں اخلاق کا جو کچھ تحفظ ہوتا تھا اس کا بہت بڑا باعث انہیں بزرگان دین کی رہنمائی اور نگرانی سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اعراس کے موقع پر بھی اچھی خاصی علمی فضا پیدا ہو جاتی تھی۔ اور بعض مورخین کا یہ کہنا کچھ زیادہ مبالغہ نہیں کہ ایسے لوگوں کے گھر حقیقی معنوں میں درس گاہیں اور تربیت گاہیں تھیں۔

نصاب اور طریقۂ تعلیم وہی جاری رہا جو ابتدا سے چلا آرہا تھا چنانچہ لکھنے

پڑھنے اور ابتدائی حساب پر تحتانی تعلیم مشتمل ہوا کرتی تھی اسی طرح قرآن مجید اور فارسی بھی پڑھائی جاتی تھی چونکہ ابراہیم قطب شاہ کے زمانے سے اردو کو فروغ حاصل ہو چکا تھا اسی لئے شاید یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ ابتدائی تعلیم کا ذریعہ اردو زبان ہوا کرتی تھی ابتدائی تعلیم میں ابتداءً حروف تہجی اور ان کا تلفظ سکھایا جاتا پھر حروف کے جوڑ بتائے جاتے اس کے بعد جملوں میں الفاظ کے استعمال سے واقف کرایا جاتا اور مشقیں کرائی جاتیں تاکہ طلبار کو دسترس حاصل ہو۔ خطاطی پر شروع ہی سے خاص توجہ کی جاتی اور اس کے لئے لکڑی کی تختیاں استعمال ہوتی تھیں جن پر سیاہی اور واسطی قلم سے لکھوایا جاتا۔ طریقہ تعلیم عام طور سے زبانی لکچروں پر مشتمل ہوتا اور کوئی چیز املا کرانے کی کم کوشش کی جاتی اور حافظے پر زور دیا جاتا اور بار بار دہرا کر کوئی چیز یاد دلائی جاتی۔

اعلیٰ تر تعلیم میں دینیات اور اخلاقیات کے علاوہ فلکیات، صرف و نحو، تاریخ، فلسفہ، قانون وغیرہ پڑھا جاتے اور جس کو جس چیز کی خواہش ہوتی اس درس میں شریک ہوتا چونکہ قطب شاہی دور کی اکثر تصنیفیں عربی اور فارسی میں ہوتی تھیں اس لئے اعلیٰ تر تعلیم کے سلسلے میں عربی اور فارسی زبان کا جاننا نہ صرف ضروری تھا بلکہ ذریعہ تعلیم بھی فارسی ہی تھا۔ اس درجے میں بھی طریقہ تدریس عموماً زبانی ہوتا تھا لیکن طلبار کو اجازت تھی کہ سوالات کریں اور استاد سے کام لیں چونکہ تعلیم کا اہم مقصد معلومات میں گہرائی پیدا کرنا تھا اس لئے تحصیل علم کے لئے کافی مدت اور محنت کرنی پڑتی تھی اور سالہا سال تک استاد کی صحبت میں رہنے سے استاد کی خوبو شاگردوں میں بھی سرایت کر جاتی تھی اور تعلیم کے ساتھ تربیت بھی خود ہی عمل میں آجاتی تھی اور استاد اپنے معتمد شاگردوں کو سے اس کے پاس آنے والے نوعمروں یا مبتدیوں کی تعلیم کا کام

کام کیا کرتا تھا جس کے باعث کوئی طالب علم اعلیٰ تعلیم سے فارغ ہوتے ہوتے اچھا معلم بھی بن جاتا تھا۔

اس مختصر مقالے میں قطب شاہی دور کی تعلیم کے تمام پہلوؤں سے بحث کرنی ممکن نہ تھی آخر میں ایک چیز خاص طور سے ذہن نشین کرانی ضروری ہے کہ قطب شاہی دور کا تعلق قرون متوسط سے تھا اس زمانے کی تعلیمی حالت کا موازنہ موجودہ زمانے کے معیاروں سے نہیں کیا جا سکتا اور یقیناً قطب شاہی سلطنت کی تعلیمی حالت اگر دیگر ہمعصر ممالک سے بڑھی ہوئی نہ تھی تو کسی سے گھٹی ہوئی بھی نہ تھی فقط

میر احمد علی خاں

حیدرآباد اکاڈیمی

سرپرست

ہز ہائنس والاشان اعظم جاہ بہادر شہزادہ برار۔ ال ال ڈی (عثمانیہ وعلیگ)
ہر ہائنس شہزادی درِ شہوار دردانہ بیگم شہزادیٔ برار

نائب سرپرست

نواب سالار جنگ بہادر

اعیان

نواب مہدی یار جنگ بہادر ام اے (آکسن) ال ال ڈی (عثمانیہ اعزازی)

مجلسِ عاملہ سنہ ۱۹۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۲ء

صدر:۔ محمد عبدالرحمن خاں اے آر سی یس؛ بی ایس سی (لندن) ایف آر اے یس

نائب صدر:۔ سید عبداللطیف بی اے (مدراس) پی ایچ ڈی (لندن)

معتمد:۔ میر ولی الدین بی اے (عثمانیہ) ام اے (علیگ) پی ایچ ڈی (لندن) بار ایٹ لا

نائب معتمد: محمد حمید اللہ ام اے، ال ال بی (عثمانیہ) ڈی فل (بون) ڈی لٹ (پاریس) وغیرہ

خازن:۔ عبدالمجید صدیقی ام اے ال ال بی (عثمانیہ)

ارکان:۔ محمد نظام الدین مولوی فاضل (حیدرآباد) پی ایچ ڈی (کنٹب)

محمد رضی الدین صدیقی ام اے (عثمانیہ وکنٹب) پی ایچ ڈی (لائپسک) ڈی ایس سی (عثمانیہ اعزازی)

سید فضل حق ام اے (علیگ) بی اے آنرس (کنٹب)

میر احمد علی خاں ام اے؛ ام ایڈ (لیڈس) بار ایٹ لا

قاضی معین الدین ام ایس سی (عثمانیہ) پی ایچ ڈی (لندن)

عبد القادر سروری ام اے ال ال بی (عثمانیہ)

نصیر الدین محمد عبد الباری ہاشمی منشی فاضل (مدراس)

مجلس ادارت و اشاعت سنہ ۱۹۴۰ء تا سنہ ۱۹۴۲ء

صدر: محمد عبد الرحمن خان

معتمد: میر ولی الدین

ارکان: سید عبد اللطیف

محمد نظام الدین

محمد رضی الدین

سید غلام محی الدین قادری زور

محمد حمید اللہ

سید مہدی علی

راحت اللہ خاں

محمد خواجہ قطب الدین

ارکان عمری

محمد رضی الدین صدیقی

نواب عزیز یار جنگ بہادر

محمد حمید اللہ

ہمدرد

نواب اکبر یار جنگ بہادر

نواب دوست محمد خاں